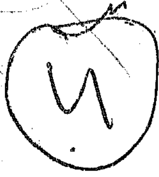
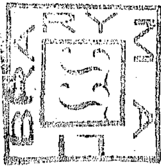
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں



سالانہ مشاعرہ

انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مع



مشاعرہ تمثیل

جس میں

۱۸۷۸ء کے شعرائے رام پور کا نمونہ دسمبر ۱۹۲۹ء کو دکھایا گیا

مرتبہ

احسن مارہروی

باہتمام سید عارف فاطمی سکریٹری انجمن خیابانِ اردو

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں باہتمام مولوی حاجی محمد مقتدی خان شروانی طبع ہوا

قیمت .. .. عمر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



مُقدّمہ

(از مہتمم)



پھر جمع کر رہا ہوں دلِ لخت لخت کو
مدّت ہوئی ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

کئی برس سے ہر سال ۳۶۵ دن کے بعد اُس نوروز کو اپنے دورِ قصری پر یکسانیت کے رنگ میں جلوہ گر دیکھتے ہوئے طبیعتیں اُکتانے لگی تھیں، جس کی انجمن آرائی بقول حکیم فردوسی ؎

پئے مشورت محفل آراستند　　نشستند و گفتند و برخاستند

سے زیادہ ہنگامہ آرا تھی۔ اس بنا پر اراکینِ انجمنِ خیابانِ اردو کے ذوقِ جدّت پسندی نے امسال اپنے سالانہ مشاعرے کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ معمولی مشاعرے کے سوا ایک ایسا تمثیلی مشاعرہ بھی کیا جائے جس کو تاریخی حیثیت سے ایشیائی ادبستان کا یادگار نمونہ کہا جا سکے اور چوں کہ اُس عہد کے بعد اس رنگ کی مجلسیں سیلابِ انقلاب میں نقش برآب ہوتی جاتی ہیں اس لئے پوری کوشش کی جائے کہ یہ نقل ہر حیثیت سے اصل بن کر موجودہ اہلِ مذاق کی دل چسپی کا سامان مہیا کر سکے چناں چہ یہ تجویز بلا اختلاف پسند کی گئی اور انجمنِ خیابانِ اردو کی طرف سے حسبِ ذیل اعلان شائع کیا گیا :؎

اداۓ خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

"اراکینِ انجمنِ خیابانِ اردو انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی نے امسال یہ ارادہ کیا ہے کہ اپنے سالانہ مشاعرے میں ایک ایسا جلسہ کیا جائے جس میں پچاس برس پہلے کے مشرقی شعرائے اردو کا نقشۂ مشاعرہ حال کے سخن وروں اور سخن فہموں کی نظروں میں کھنچ جائے۔

یہ جلسہ رام پور کے ایک مشاعرے کا تمثیلی نمونہ ہوگا، جس میں اسیر، بحر، منیر، تسلیم، امیر، داغ، جلال اور دیگر شعرا اس نقلی ہیأت میں کالاصل رونق افروزِ محفل ہوں گے۔ یہ صورتیں اُسی عمر اور اُسی وضع کے مطابق اسی کلام کو پڑھتی ہوئی نظر آئیں گی جس کو اب سے نصف صدی پہلے اُن اہلِ کمال نے اپنی زبانوں سے پڑھا تھا۔"

اس اعلان کی اشاعت نے بعض اہلِ مذاق کی ذہنیت پر طرح طرح کے اثر ڈالے جس سے اس جدّتِ خیال کی دل کشی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ایک صحیفہ نگار نے یہ خیال قائم کیا کہ اس تمثیل کے مماثل وہ شعرائے عصر ہوں گے جو بیرونجات سے مہمان کی حیثیت سے بلائے جائیں گے۔ جال آں کہ ایسا ہونے کی حالت میں مشتہر کا فرضِ اوّلین تھا کہ وہ اُن محترم ہستیوں سے اجازت حاصل کرتا اور اگر اُن کی مرضی ہوتی تو اس کا اعلان بھی اُسی دعوت نامے میں کیا جاتا۔ معلوم نہیں کہ ان باتوں کے بغیر یہ کیوں سمجھ لیا گیا۔ اغلباً یہ خیال اس لئے قائم کیا گیا کہ پچاس برس پہلے کی ہستیاں اکثر شعرائے عصر میں مل سکتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ اُن کے حافظے میں یہ بات محفوظ نہ رہ سکی یا کسی خاص اشتعال آمیز جذبہ داثر نے اس پر غور کرنے کا موقع نہ دیا کہ پچاس برس پہلے کی جو ہستیاں پیش کی جائیں گی اُن میں مختلف عمروں کے شعرا ہوں گے نہ کہ سب کے سب اسیر و بحر کے ہم سن۔ اس حسنِ ظن کے علاوہ ایک گروہ کی یہ خوش فہمی قابلِ رحم تھی کہ مہتمم مشاعرہ سے بار بار یہ پوچھا جاتا تھا کہ کیوں صاحب پچاس برس پہلے کی مشہور ہستیاں کس طرح مشاعرے میں رونق افروز ہوں گی۔ اس کے جواب میں جب اُن سے یہ کہا جاتا کہ مسمریزم اور پلانچٹ کے ذریعے سے اُن کی روحیں بُلائی جائیں گی تو اُس وقت اُن کی حیرت نما شکلیں ایک ایسا مرقع پیش کرتی تھیں جن کی تصویر کھینچنا تصوّر کے سوا کسی دوسرے کے بس میں نہیں۔ بہرحال ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مئے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

المختصر اعلان کے مطابق تمثیلی مشاعرے کو کامیاب بنانے کے لئے جس قدر امکانی کوششیں ہوسکتی تھیں، کی گئیں۔ اب سے پچاس برس پہلے کا زمانہ دیکھنے والے تو ابھی بہت لوگ موجود ہیں مگر اُن سب کی تلاش اور پھر اُن سب کا اُن حضرات سے بخصوصیت متعارف ہونا اور اپنے مفید مطلب باتوں کا معلوم کرنا آسان کام نہ تھا۔ اس سامان کی فراہمی میں جس قدر اور جتنی دشواریاں ہوسکتی ہیں اُن کی تفصیل ضمناً اپنی خدمت گزاری کی داد خواہی ہے۔ لہذا اس وضاحت کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔ دربارِ رام پور کے مجوّزہ شعرا میں چار پانچ ہستیاں ایسی تھیں جن سے خود راقم

واقف تھا اور اُن سے شرفِ نیاز حاصل کر چکا تھا، پھر بھی اُن کے وہ تمام واقعات و حالات بالترتیب معلوم نہ تھے جن کے بغیر اس تمثیل کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس تجسّس و تفحّص کی خاطر ریاستِ رام پور کا سفر کیا جائے مشاعرے سے بیس پچیس دن پہلے یہ سفر کیا گیا۔ رام پور کا سرکاری کتب خانہ جو فی الحقیقت اپنی نوادرات اور خصوصیات کے لحاظ سے ایک نادر الوجود علمی مخزن ہے، مجھ تشنۂ تلاش کی پیاس نہ بجھا سکا اور یہ محض اس لئے کہ ہماری قوم میں اب سے نصف صدی قبل ایسی معمولی کارروائیوں کو قلم بند کر دینے کی عادت نہ تھی۔ خیال تھا کہ وہ مشاعرے جو نواب خلد آشیاں کے عہد میں ہوا کرتے تھے اُن کے گلدستے جمع ہو کر کتاب خانے میں محفوظ ہوں گے لیکن یہ گمان غلط ثابت ہوا اور سنا گیا کہ ایسے مجموعے حضرت منشی امیر احمد امیر مینائی مغفور کے پاس تھے جن کو ایک آتش زدگی نے خاک سیاہ کر دیا۔ اب اس کے سوا کوئی تدبیر نہ تھی کہ اُس عہد کے بزرگوں کی معلومات سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ چناں چہ اس خصوص میں محترمی جناب حافظ احمد علی خاں صاحب مہتمم کتاب خانۂ رام پور اور معظمی جناب حافظ منشی محمد احمد صاحب صریر مینائی خلف اکبر حضرت امیر مینائی سے جس قدر ہدایات و امداد حاصل ہو سکیں قلم بند کی گئیں اور انھیں روایات کے مطابق اس تمثیلی مشاعرے کی تکمیل کی گئی۔ میں بخلوص دل مسبوق الذکر بزرگوں کا تہِ دل سے مشکور اور ممنون ہوں اگر اُن کی رہ نمائیاں خضرِ طریق نہ بنتیں تو اس منزل تک پہنچنا فسانۂ سکندر ہو جاتا۔

غرض کہ اس خصوص میں جس قسم کی معلومات بہم پہنچائی گئی اُن سب کی تشریح اُن شعرا کے کلام کے ساتھ لکھی جائے گی ان حالات کے بعد بڑی اور بہت بڑی مہم یہ تھی کہ اُس زمانے کے مطابق لباس وغیرہ فراہم کیا جائے۔ اس مہم کے سر کرنے کے لئے علی گڑھ اور رام پور میں کسی قسم کی کامیابی کی کوئی تدبیر نہ ہو سکی یقیناً یہ تمثیل ناتمام رہ جاتی اگر میرے شفیق دوست مولوی ابرار حسین صاحب فاروقی لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی زحمت فرما کر اپنے خاص اثر سے اُجڑے ہوئے دیار (دہلی شریف) کے چکّر نہ لگاتے۔ اگرچہ اُن کی نحافتِ جسامت نے ملّا رموزی جیسے ہین نکتہ رس کو دوچار نہ ہونے دیا۔ مگر باور کیجئے کہ یہ پیکرِ تمثیلی بے جسد روح کا مجسّمہ ہوتا اگر جناب فاروقی قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا کی تلاوت فرما کر زینت بخشی نہ فرماتے۔

ان تمام مراتب و مراحل طے ہو جانے پر ایک آخری مشکل اور درپیش تھی یعنی مماثل کا ملنا جس کے لئے لسان الغیب کی پیشین گوئی ہے: ؎

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ظاہر ہے کہ ایسے لوگ دہلی، لکھنؤ اور آگرے سے تو بلائے نہیں جا سکتے تھے ۔ ہر پھر کر اپنے کالج ہی کے دائرے میں گھومنا تھا۔ بالآخر یہ سعی بھی مشکور ہوئی اور محبیّ صادق جناب مولوی محمد حاذق صاحب ایم اے لکچرار انٹرمیڈیٹ کالج کی جواں ہمتی نے مجھ جیسے کاہل الوجود اور میر فرش کو اس میدان میں فاتح ہفت خواں بنا دیا۔

میں نے اس روداد کے لکھنے میں بالقصد اختصار سے کام لیا ہے اور وہ اس لئے کہ تمام تشریحات اپنے اپنے موقع پر اس مطبوعہ مجموعے میں نظر آئیں گی ۔ اس لئے مشاعرے کی توضیح کو چند مختصر نوٹوں میں منحصر کرتا ہوں :۔

۷ ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو ٹھیک ۸ بجے بعد عشا یونیورسٹی کے میرس یونین ہال میں عام مشاعرہ شروع ہوا۔ سامعین و حاضرین کی تعداد ہال کی گنجائش سے زیادہ تھی۔ چوں کہ اصل اعلان اور خاص شغف تمثیلی مشاعرے کے متعلق تھا اس لئے بیرونی مشاہیر شعرا میں بہت کم حضرات تشریف لا سکے کیوں کہ ان میں اکثر اصل مشاعروں کو دیکھے ہوئے تھے پھر نقل کی وقعت کیا ہوتی۔ سب سے پہلے راقم حروف نے اپنے ٹوٹے پھوٹے مختصر الفاظ میں صدارت کے لئے اپنے ادب نواز محترم عالی جناب قریشی صاحب پرنسپل کالج کا نام نامی پیش کیا اور جناب موصوف نے بکمال شفقت و رافت صدارت کی کرسی کو رونق بخشی۔ جلسے کا افتتاح حسب معمول قرآن خوانی سے ہوا۔ اس کے بعد سید محمد عارف فاطمی سکرٹری انجمن خیابانِ اردو نے گزشتہ جلسے کی روداد پڑھی۔ اس کے بعد عالی جناب محترم صدر نے اپنا بے مثل فصیح و بلیغ خطبۂ صدارت پڑھا جس کا مطالعہ اس روداد کے بعد نظر افروز ہوگا۔ پھر زیادہ تر مقامی شعرا اور طالبانِ علم نے غیر طرح غزلیں پڑھیں۔ اسی سلسلے میں چند مشاہیر شعرا نے اپنا اپنا غیر طرحی کلام سنا کر اہلِ ذوق کو محظوظ کیا۔ جس کا مختصر انتخاب آئندہ صفحات پر درج ہے۔

جن حضرات نے پہلے جلسۂ مشاعرہ میں رونق افروزی فرمائی اُن میں عالی جناب نواب مسعود جنگ بہادر وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کی تشریف آوری ہمارے لئے باعثِ صد افتخار و ناز ہے۔ خصوصاً اس حالت میں کہ ممدوح اُس وقت یونیورسٹی کے ضروری اور اہم خدمات میں بے حد مصروف تھے لیکن اپنی وسیع النظری اور عالی ہمتی سے چند گھنٹوں تک مشاعرے میں رونق افروز رہ کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔

بارہ بجے رات کو مشاعرہ ختم ہوگیا اور دوسری رات کے لئے اُسی وقت کا اعلان کیا گیا۔

۸ دسمبر کو بہت پہلے سے مجمع شروع ہوا۔ ۸ بجتے بجتے یونین ہال میں کھڑے ہونے کو جگہ نہیں رہی۔ تمثیل کے سامان کی درستی اور اُس کے نمائندوں کے اطمینان و یک سوئی کے لئے چبوترے (ڈائس) کو پردے سے چھپا دیا تھا۔ پورے ۸ بجے یکایک پردہ اُٹھایا گیا۔ اُس وقت کا منظر ایسا دل کش و دل آویز تھا جس کی تصویر تحریر میں نہیں کھچ سکتی۔ اس مجموعے میں اُس کا مرقع چھاپا جاتا ہے جس سے ناظرین کچھ کچھ اندازہ کرسکتے ہیں۔ یہ تمثیل ۱۱ بجے سے پہلے ختم ہوگئی۔

آج مشاہیر شعرا میں جناب اصغر گونڈوی، جناب جگر مراد آبادی، جناب مانی جائسی، جناب فرخ بنارسی رونق افروز تھے۔ تمثیل ختم ہونے کے بعد ان حضرات کے کلام سے سامعین محظوظ و مسرور ہوئے اور بصد کامیابی یہ کارنامہ ختم ہوا۔

تمثیلی نمائندوں میں سب نے اپنا اپنا پارٹ نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ دیکھنے والوں کو وہ نقلی نظارہ ہوبہو اصلی مظاہرہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ تمثیل شروع ہونے سے چند منٹ پہلے تک مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ یہ بازیِ طفلاں فی الحقیقۃ ادب نوازی کا صحیح مرقع پیش کرے گی۔ نوجوانوں کی شوخ طبیعتیں۔ اُن کی بے چینیاں کسی طرح اُن کو نچلا بیٹھنے نہیں دیتی تھیں، لیکن پردہ اُٹھنے کے بعد جس سنجیدگی اور متانت و وقار سے خوش تمیز طالب علموں نے اپنے فرائض کو انجام دیا ہے اُس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔

ان کامیاب نمائندوں کے لئے انجمن خیابانِ اُردو کی طرف سے تمغے دینے تجویز ہوئے تھے جج صاحبان نے ۳ عزیزوں کو ترتیب وار نمبر دیئے، چنانچہ نمبر اول تمغا، شہزادہ مرزا رحیم الدین حیا گورگانی دہلوی کے نمائندے عزیزی محمد طاہر حسین زبیری مارہروی طالب علم درجۂ یازدہم کو اور دوسرے نمبر کا تمغا منیر شکوہ آبادی کے حامل عزیزی مقبول الرحیم متعلم درجۂ دوازدہم کو اور تیسرے نمبر کا تمغا شمس العلماء مولوی عبدالحق خیرآبادی کے قائم مقام عزیزی سید زوار حسین متعلم درجۂ دوازدہم کو دینا تجویز ہوا۔ واقفیتِ عامہ کے لئے تمثیلی مشاعرے کا ایک نقشہ مرتب کرلیا تھا جس کو چھپوا کر حاضرین میں تقسیم کردیا تھا اُس کی ایک نقل اس مجموعے میں درج کی جاتی ہے جس سے مفصل حال معلوم ہوسکے گا کہ کتنے مشاہیر شعرا تمثیلی مشاعرے میں شریک ہوئے تھے اور اُن اصل شعرا کی قائم مقامی کے فرائض کن طالب علموں نے کامیابی کے ساتھ انجام دیئے تھے۔ انجمن خیابانِ اُردو کے سکرٹری عزیزی سید محمد عارف فاطمی متعلم درجۂ دوازدہم جو گزشتہ مشاعرہ

۱۹۲۹ء کی ٹرافی جیتے ہوئے اور موجودہ تمثیلی مشاعرے کے صدر بنے ہوئے تھے اپنے حسنِ خدمات اور مساعیِ جمیلہ کے لحاظ سے مستحقِ انعام سمجھے گئے جن کو راقم آثم نے اپنی طرف سے ایک نقرئی تمغا تجویز کیا۔ مجھے اس مشاعرے کا پہلے سے کوئی خیال نہ تھا بلکہ امسال اپنی سہ ماہہ مسلسل علالت کی وجہ سے اتنی ہمت بھی نہ پاتا تھا کہ معمولی فرائض بھی پورے کرسکوں گا لیکن جناب محترم پرنسپل صاحب کی شفقت آمیز ہمت افزائیوں نے یہ کرامت دکھائی کہ مجھ جیسا ناکارہ و معطّل بات کی بات میں اس قابل ہو گیا ؎

دوش کز معجزۂ لعل تو گویا گشتم
آں قدر گفتم ازاں لب کہ مسیحا گشتم

یہ مختصر روداد ادھوری رہ جائے گی جب تک کہ میں اپنے ہر دل عزیز دوست جناب عبدالعزیز پوری صاحب ایم اے ال ال بی کا زبان وحلق سے نہیں بلکہ دل سے شکر گزار نہ ہوں۔ اگر اُن کی خوش انتظامیاں اور با اثر برجستہ کلامیاں میری معین وحامی نہ ہوتیں تو میں کوئی کام اور کوئی بات نہ کرسکتا۔

شکر گزار

احسن مارہروی

علی گڑھ کالج کا مشاعرہ

(از ملّا رموزی)

تمام دنیا کے علوم و فنون سے ۱۹۲۹ء کے آخر میں جب یہ ثابت ہو چکا کہ کچھ بھی ہو لیکن کالج میں مشاعرہ ہو کر رہے گا اور عین جاڑے ہی کے موسم میں ہو کر رہے گا تو ہم بھی اپنی زندگی کو خدائے جاں آفریں کے سپرد کر کے ٹھیک ۸ بجے شب کو حضرت گرامی ادب نواز نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خان بہادر بالقابہ (بھوپال) کے ایک شاندار موٹر پر سوار ہو کر علی گڑھ کالج کی "مشہور مشاعراتی عمارت" عرف یونی ین کے دروازہ پر اس نستعلیق انداز میں جا کر کھڑے ہو گئے کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی، مگر وہ جو صاحبزادہ حامد کمال اور صاحبزادہ علی منصور حضرت ملا رموزی سے پہلے موٹر سے برآمد ہوئے تو تمام دنیا کے پروفیسروں کو یقین ہو گیا کہ ملا صاحب تشریف لے آئے۔

پروفیسر محمد حاذق، ایم اے ایل ایل بی، پروفیسر مولٰنا سید محمد علی احسن، احسن مارہروی صدر انجمن خیابان اردو، پروفیسر عبدالعزیز پوری ایم اے، ایل ایل بی، فوراً ہی تشریف لائے اور السلام علیکم کے بعد یہ بھی تو دریافت نہ فرمایا کہ مزاج شریف، خیریت تو ہے، سفر میں آپ کے اسپیشل پر کوئی بم تو نہیں پھینکا گیا، گھر میں تو سب طرح خیریت ہے۔ اور بچے تو اچھے ہیں، بس وہ تو آئے اور اسلامی جذبۂ اخوۃ میں ڈوب کر فرمایا۔ آئیے آئیے تشریف لائیے۔ تشریف لائیے اب آپ ہی فرمائیے کہ ایک چھوڑ تین بزرگوں کے اس دل نواز اصرار پر کیسے ممکن تھا کہ ہم بجائے یونی ین میں تشریف لے جانے کے الٹے اپنے وطن تشریف لے جاتے؟

غرور، نخوت، تکبّر، انانیت کی تمام عزازیلی قوتیں بیدار ہو گئی تھیں۔ جب ہمارے داخلہ پر طلبہ نے تالیوں سے "سر کو آسمان پر اٹھا لیا" صدارت والے چبوترے پر سے حضرت گرامی محمد عبدالمجید صاحب قریشی ایم اے، پرنسپل کالج نے

کھڑے ہو کر استقبال فرمایا۔ چوں کہ حضرت پرنسپل صاحب سے اب معاملات ..... دوستی کی حد تک جا پہونچے ہیں اس لئے بیٹھتے ہی "پرائیوٹ" کا سلسلہ شروع ہو گیا، کچھ ممدوح ہنسے اور کچھ ہم، پاس ہی بیٹھے تھے حضرت عالی پروفیسر عبدالشکور ایم اے، کسی قدر اونچے ہوئے اور مصافحہ والے ہاتھ میں سے ایک اور ہاتھ کو ہمارے ہاتھ سے جوڑ کر فرمایا آپ ہیں حضرت نواب مشتاق احمد خاں صاحب بی اے (آکسن) خلف اکبر حضرت نواب وقار الملک بہادر عفران مکان اور ملا رموزی سے ملنے کے شائق۔ تصدیق یوں ہوئی کہ حضرت نواب صاحب ممدوح بھی بے حد تپاک سے پیش آئے وہ تو کہئے کہ "مشاعرہ کا وقت طلوع ہونے والا تھا" ورنہ نواب صاحب بہادر ضرور ارشاد فرماتے کہ ملا صاحب کل صبح میری ہی کوٹھی پر "تناول ماحضر فرمایئے گا" افغانی سفر کے بننے میں عالی منزلت پروفیسر خاوری بھی بیٹھے نظر آئے۔ چبوترہ کی پہلی سطر میں عالی جناب محمد عمر خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور جامہ دار کی شیروانی پہنے بیٹھے تھے۔

انگریزوں نے سائنس کے زور سے "ایک ایسا "عمل" تیار کر دیا ہے کہ جس شخص کو صحیح وقت معلوم کرنا ہو وہ اپنے اُلٹے ہاتھ کی کلائی کو آستین ہٹا کر ایک مرتبہ دیکھے فوراً معلوم ہو جائے گا کہ ۸ بج کر ۷ منٹ آ گئے ہیں اس لئے حضرت پرنسپل صاحب نے اسی عمل سے کام لے کر فرمایا کہ .. لو بھئی ملّا صاحب وقت ہو گیا مگر میرا چشمہ ٹوٹ گیا ہے۔ خیر بغیر چشمہ ہی کے سہی، ادھر مشاعروں کی صدارت کے انتخاب کے لئے کوئی اذان تو دی نہیں جاتی ہے صرف قبلہ جناب احسن تھے اس شور و غل میں جو کالج کے طلبہ کی صفوں میں گونج رہا تھا کچھ ہونٹ ہلائے تھے کہ پرنسپل صاحب صدر ہو گئے اور تالیاں بج گئیں۔

علومِ اسلامی سے واقف مسلمانوں کے نزدیک انسانی جذبات و اعتقاد کے لئے وہ گھڑی سب سے زیادہ قابلِ عظمت و احترام ہوا کرتی ہے جب خدائے عرش و فرش کی عظمت و کبریائی کا کوئی مظاہرہ کیا جائے۔ چنانچہ محترم صدر نے اشارہ کیا اور ایک صاحب نے اٹھکر قرآن محترم کے ایک رکوع سے اس مجلس کا جب افتتاح کیا تو ساری محفل پر ایک پُر جلال سناٹا طاری تھا۔ ہر چھوٹا اور بڑا "علی گڑھیا" ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور نہیں کہہ سکتے کہ اس وقت علی گڑھ والوں کے دینی احساس کا کس درجہ دل نواز و روح پرور اندازہ ہو رہا تھا۔

اس کے بعد صدر محترم نے زبانِ اُردو میں اپنا وہ خطبۂ صدارت پڑھا جو اس مضمون کے ساتھ ہی کہیں نظر آئے گا

اور چوں کہ یہ خطبہ صدارت متعلق تھا مشاعرے سے اس لئے اس کی اصولی داد بھی شعرا ہی کے ذمہ ہے اور ظاہر ہے کہ ہم پورے شاعر نہیں مختصر سے شاعر ہیں اس لئے اس خطبہ کے متعلق اتنا کہہ سکتے ہیں کہ پرنسپل صاحب نے ہزاروں انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں کے سامنے یہ بات ثابت کردی کہ اگر ہندوستانی بھائی اپنی مجلسی زندگی میں خطاب و بیان کے لئے اپنی ملکی، قومی اور مذہبی زبان اُردو کو اختیار کریں تو اسے سب سمجھ بھی سکتے ہیں اور اس سے انگریزوں کی نظر میں ہندوستانیوں کی عزت بھی بڑھ سکتی ہے۔

حضرت مولانا احسن مارہروی قبلہ اور ممدوح کے "ادبی باڈی گارڈ" کی کرسیاں پہلے کب صدر کی کرسی سے دُور ہوا کرتی تھیں جو اس مرتبہ بھی دور ہوتیں۔ اس لئے پاس ہی کی کرسی سے انجمن خیابان اُردو کے معتمد صاحب کھڑے ہو کر سال بھر کے کارناموں کو سُنایا اور لوگوں نے اسے مجلس کی سالانہ روداد سمجھ کر خوب سُنا، معتمد صاحب کی آواز صرف اوھی کے کام آرہی تھی مجلس کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا، اب مشاعرے کے معاملات "چھڑ چکے تھے" کہ طلبہ میں ہل چل سی پیدا ہوئی اور یکایک تالیوں کے شور سے مکان گونج اٹھا دیکھا تو حضرت عالی نواب مسعود جنگ بہادر وائس چانسلر یونیورسٹی تھے۔ بس اسلامیانِ ہند کی اس عزیز و مقبول ہستی کا اثر تھا کہ چبوترے پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے آپ کی تعظیم کے لئے تو بھی اُٹھ میں بھی اُٹھ، یہ بھی اُٹھ اور۔ وہ بھی اُٹھ۔ یہاں تک کہ صدر جلسہ تک "اُٹھ ہو گئے" اب جو ممدوح رونق افروز ہوئے تو پھر "۔ مطلع عرض ہونے لگا"، اُس وقت خیال آیا کہ اگر آج کو نواب مسعود جنگ بہادر بالقابہ کی جگہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر قیصر جرمنی ہوتے تو وہ قیامت تک بھی مشاعرہ میں رات کے گیارہ بجے تک شریک نہ رہتے مگر نواب صاحب ممدوح کی شرکت سے ثابت ہوا کہ آپ اصول کی عزت کرتے ہیں اور چونکہ مشاعرہ تھا کالج کا اس لئے نواب صاحب ممدوح کا اس کی حوصلہ افزائی کے لئے تشریف لانا اصل میں اصول کی پابندی تھی اور اتفاقاً تو مولانا احسن مارہروی نے ممدوح کی شرکت سے یہی فیصلہ کیا ہوگا کہ "آیندہ سال کا مشاعرہ اس سے بھی شاندار منعقد کروں گا"

پچھلے سال کی چند "ملّارموزیانہ سفارشات" جو اس مشاعرے کی جماعتِ انتظامیہ میں منظور ہو چکی تھیں۔ تو اس میں ہم ملّارموزی ہی نے ان سے بڑی تکلیف اُٹھائی، یعنی وہ جو ہم نے لکھدیا تھا کہ غزل کے درمیان "حقہ پانی بند" رہنا چاہیے

تو اس مرتبہ مشاعرہ کی اس اسمبلی کے "واچ اینڈ وارڈ" حضرت پروفیسر پوری اور اس شعری مجلس مقننہ کے "مارشل" پروفیسر محمد حاذق صاحب نے پانی، پان، چائے اور سگریٹ کی تقسیم کی سخت ممانعت فرمادی تھی۔ کوئی تین گھنٹہ تک ایک پکّے مسلمان روزہ دار کی طرح خموش بیٹھے رہے مگر خدا جانے کیا منظور تھا حاذق صاحب کو کہ جوں ہی کہ اکبرآباد کے ایک صاحب نے غزل شروع فرمائی حاذق صاحب کے بھاگوں سگریٹ کا چھینکا ہی ٹوٹ پڑا اور ممدوح نے آن کی آن میں سارے چبوترے والوں کو سگریٹ پلادیئے۔ ایسی صورت میں پوری صاحب کو کونسا "خوفِ خدا" مانع تھا جو آپ خموش بیٹھے رہتے اس لئے آپ سے اور کچھ نہ بن آیا تو آپ نے ایک شاعر صاحب کا "گلا دھونے کے لئے" ایک گلاس پانی لاکر صدر صاحب کی میز پر رکھدیا شاعر صاحب نے بھی "پانی پی پی کر" خوب خوب غزل سنائی۔

نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ "شہرت" "تبلیغ" "ماحول" اور "پراپیگنڈے کے اثر سے ہر قسم کا انسان متاثر ہوکر رہتا ہے اور وہ اس اثر کا تابع ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ اثر اس کی فطری وضع سے کتنا ہی دُور کیوں نہ ہو مثلاً ایک وقت تھا جب "علی گڑھ کے کھلنڈرے" دنیا کی حیرت انگیز چیز سمجھے جاتے تھے یا "شرارت" اور ریلوے اسٹیشن ماسٹروں کو دق کرنا علی گڑھ کے طلبہ کا خاصۂ فطرت تسلیم کرلیا گیا تھا اور اسے قابل تعریف "زندہ دلی" کہا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ روایات اب روایاتِ پارینہ سے کچھ زیادہ نہیں رہیں پھر بھی ان کی شہرت کا یہ اثر ہے کہ علی گڑھ میں داخل ہو کر خشک سے خشک فطرت طالب علم بھی چاہتا ہے کہ وہ کوئی شرارت فرمائے تاکہ علی گڑھ کا طالب علم مان لیا جائے یا جیسے ہندوستان میں افغانیوں کو "بہادر" مشہور کردینے سے ملّا رموزی ایسے "فدویانہ جسم کے بزرگ" بھی ریلوے ٹکٹ کلکٹروں کو ہر آن مرعوب رکھنے پر تلے رہتے ہیں غرض اسی قسم کے جذبات کے تحت ایک "الہامی شاعر صاحب" نے جب غزل شروع کی تو اگرچہ یہ "سوٹ پہنے ہوئے تھے" پھر بھی طلبہ کی صفوف سے ایک آواز آئی کہ "بس مقطع سنا دیجئے اور تشریف لے جایئے!"

چوں کہ کالج کی روایات میں علم و ادب کی تحقیق و ترقی بھی شامل ہے اس لئے مشاعرہ کے بعد یعنی دوسری رات کو "تمثیل" کے ذریعے حضرات داغ دہلوی اور امیر مینائی کے عہد کی شاعری دکھانا بھی منظور ہو چکا تھا اور اسی مقصد کے لئے حضرت مولانا احسن مارہروی قبلہ نے عالی منزلت نواب کلب علی خاں بہادر مغفور تاجدار رام پور کے مشاعروں کے صحیح حالات

کی تحقیق ونقل کے لئے رام پور تک۔ دوڑ بھی فرمائی تھی۔ اور دھوپ بھی۔ اور رام پور کے نہایت معتبر "سلطانی گواہوں" کے بیانات سے اس تمثیل کو "مطابق اصل" بنایا تھا، چند طلبہ کو حضرات داغ دہلوی، امیر مینائی وغیرہم کا لباس پہنا کر ایک درباری مشاعرہ مرتب فرمایا تھا۔

بظاہر تو یہی تھا کہ کالج کے چند طلبہ لمبی لمبی داڑھیاں لگا کر اور عبائیں پہنکر عبدالرحمٰن چغتائی کا بگڑا ہوا دیوان غالب بن کر بیٹھ گئے تھے مگر علمی اور فنی نقطۂ نظر سے ۱۹۲۹ء میں یہ ایک ایسی "بے مثل چیز تھی" جس کے لئے حضرت مولانا احسن مارہروی اور پرنسپل صاحب کالج کے کمال تربیت اور حسن صلاحیت کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔

دوسری شب کو جب پردہ اُٹھا تو واللہ حیرت سی طاری تھی ہر شخص پر یہ دیکھکر کہ علی گڑھ میں رام پور کا شاعرانہ دربار اپنی ایک ایک ترکیب کے لحاظ سے مکمل و مرتب طریقے پر منعقد ہے، جس طالب علم نے جس شاعر کی نقل کی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس یہ تو بیٹھے ہیں امیر مینائی اور وہ دیکھئے وہ بیٹھے مونچھوں کو تاؤ دے رہے ہیں حضرت نواب مرزا خاں داغ۔

اس تمثیل کے بے شمار ادبی نکات و فوائد ہم تو آج بسط و شرح سے لکھکر پھینک دیں علی گڑھ کی طرف مگر سوال تو ہے حضرت گرامی قدر مولوی "باہتمام محمد مقتدی خاں صاحب" کے تاؤ کا کہ وہ ایسی طویل روداد کے بس چار صفحات چھاپ کر باقی پھینک دیں گے ملا رموزی کی طرف تو؟

اس لئے خلاصہ یوں ہے اس تمثیل کا کہ اس کے دیکھنے سے ثابت ہوگیا کہ کہنے کو "تو یہ دور ہے" عہد علم و ترقی" لیکن "ادبیات اردو" خصوصاً اردو کے مشاعروں نے نصف صدی میں بس اس قدر ترقی کی ہے کہ شر کار کو آج کل چائے پلا دیتے ہیں باقی کے تمام حالات وہی ہیں جو آج سے نصف صدی پہلے مشاعروں میں پائے جاتے تھے، یقین نہ ہو تو مجلۂ ادبیہ "نگار لکھنؤ" بابت ماہ فروری ۱۹۳۰ء کی اشاعت میں اردو کے مصدر شہر لکھنؤ کے ایک تازہ مشاعرہ کے حالات دیکھ لو اور پھر اس نصف صدی پہلے کے مشاعروں کی تمثیل کو دیکھ لو وہی شور ہے گا اور وہی ہائے ہائے باقی سب خیریت ہے اور حقیقتہً یہی ایک گراں قدر و گراں مرتبت فائدہ تھا جو اس تمثیل سے علی گڑھ نے سارے ہندوستان کے مشاعروں کی اصلاح اور تبدیلی کے لئے اس تمثیل سے پہنچایا اور زندہ رہیں وہ طلبہ جنھوں نے اس نقل کو اصل سے ملا دیا۔

تمثیل کے بعد ملک کے ممتاز و معروف شعرا، حضرت عالی مانی جائسی، حضرت عالی فرخ بنارسی، حضرت عالی جگر مرادآبادی

اور حضرت عالی آصغر گونڈوی نے بکمال خوش اسلوبی ایک ایک غزل سنائی اور ان حضرات کی صحیح معنی کی شعری قابلیت اور مسلّمہ شہرت نے سامعین کو بے قرار بنائے رکھا، وہ تو کہیے کہ بس نہ چلا ورنہ طلبہ ان تمام حضرات کے اسٹیج والی چبوترے پہ بنا دیتے مگر اٹھنے نہ دیتے کہ یکایک اس شاعرانہ پارلیمنٹ کے "لارڈ اسپیکر حضرت پروفیسر حاذق نے ۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ایک تقریر مہمانوں کے شکریے کے لئے فرما دی، پھر کسے تاب کہ ملا رموزی صاحب کی "جوابی تقریر" تک وہ مشاعرہ میں "باقی رہتا" بس ابھی کہ اس تقریر سے "جلسہ پر خموشی چھائی تھی" کہ گھنٹی کی آواز آئی اور سب کے سب اپنے اپنے "کمبل دبا کر ... ... فقط

آخر میں ہم حضرت گرامی پرنسپل صاحب کے حسنِ انتظام حضرت گرامی مولنا احسن مارہروی کے بند و بست اور گرامی منزلت نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خان بہادر بالقابہ کو مبارکباد دیتے ہیں جنھوں نے اس ممتاز دارالعلوم کی ادبی روایات کے بقاء و ترقی کے لئے اپنی بہترین توجہات کو مبذول فرمایا۔

"برحمتک یا ارحم الراحمین"

خطبۂ صدارت

(از جناب عبدالمجید صاحب ایم اے قریشی پرنسپل انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

جناب وائس چانسلر صاحب

مہمانانِ محترم اور عزیزانِ انٹرمیڈیٹ کالج - السلام علیکم

شعرائے کرام اور معزز مہمانوں کو دیکھکر میرے دل میں مختلف جذبات موجزن ہیں اور ان میں سب سے قوی یہ ہے کہ ان کو خوش آمدید کہتے ہوئے ان کی تکلیف فرمائی کا شکریہ نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ کالج کے جملہ اساتذہ و طلباء کی طرف سے ان کی خدمت میں پیش کروں۔ اس کے ساتھ ہی آپ حضرات سے یہ بھی امید رکھتا ہوں کہ اگر ہم لوگوں سے سلسلۂ خدمت مہمان نوازی میں کسی قسم کی فروگزاشت ہو جائے جو لازمۂ بشریت ہے تو اس کو نظر انداز فرما کر ہم کو مزید شکرگزاری کا موقع عطا فرمائیں گے۔ اس کے بعد میں یہ بھی ظاہر کردینا چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کی موجودگی سے تقویت پہونچی ہے اور میں اپنے اندر ایک ایسا جذبۂ افتخار محسوس کرتا ہوں جو صرف باہمی اعتماد اور باہمی ارتباط سے پیدا ہوتا ہے۔ اس مجمع اور اس جذبے کو میں اپنے پیشِ نظر مقصد کے لیے فالِ نیک سمجھتا ہوں۔

حضرات - تعلیم و تربیت کا اصلی منشا ظاہر ہے محض درس و تدریس نہیں ہے میرے نزدیک اصلی تعلیم و تربیت نام ہے اُن تمام طریقوں کا جن سے انسانی زندگی مفید اور دلچسپ بنائی جاسکے۔ مفید کے معنی ڈگری لینا یا دلچسپ بنانے کا مفہوم مشاعرہ کرنا نہیں ہے۔ میرے نزدیک ہر مفید چیز دلچسپ ہے اور ہر دلچسپ چیز مفید ہے۔ آپ متعجب یا متغض ہوں اگر میں عرض کروں کہ بعض حیثیات سے میں بزمِ مشاعرہ کو کلاس روم سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔ لیکن بزمِ مشاعرہ سے میری مراد ہماری آپ کی مجلسِ مشاعرہ نہیں ہے جہاں صرف شعر پڑھے جاتے ہیں اور تالیاں بجائی جاتی ہیں اور کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔ میرے نزدیک مشاعرے کا صحیح مفہوم اور مقصد وہ تھا جس کی ابتدا ان لوگوں نے کی تھی جو ہم سے تعلیم، تمدن اور تہذیب میں کم تھے۔ بہت کم لیکن

جن کے دلوں میں صداقت موجزن تھی۔ جن کی زبانوں میں تلوار سے زیادہ برّش تھی اور جن کے اشعار سے قومیں بنتی اور سنورتی تھیں۔ وہ ہماری طرح صرف موزوں کلام نہ تھے صرف حق گو تھے۔ وہ نہ

ترپا کیئے قدیم تھے دو دچراغ کے

اور نہ تالیاں بجانا جانتے تھے۔ وہ تلواریں کھینچ کر اور سر بکف ہو کر شعر کہتے تھے۔ اور سامعین بھی سر بکف ہو کر سنتے تھے۔ عرب ارضِ الہام تھا۔ کلام پاک سے پہلے اس کے پیمبر۔ اس کے قافلہ سالار اور اس کے جنرل شاعر ہی تھے

حضرات۔ میری تلخ نوائی معاف فرمائیے۔ میں ابھی کہہ رہا تھا کہ میں مشاعرہ کو کلاس روم پر ترجیح دیتا ہوں۔ آپنے سن لیا میں کس مشاعرے کا قائل ہوں اور کس شاعر کا معتقد کلاس روم تو ایک مشین ہے اور اس کی یہ تکلیف دہ حیثیت روز بروز متیقّن ہوتی جاتی ہے۔ لیکن یہ مشاعرہ وہ مقام ہے جہاں حوصلے پیدا کئے جاتے ہیں۔ جہاں خیالات کی تخلیق ہوتی ہے۔ اور خیالات کی تخلیق ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کب اور کس طور پر ان پیغامات غیب کی ترجمانی کرنا چاہیئے۔ قوموں کے معلم شعراء رہے ہیں۔ آج آپ زندہ قوموں کے کارناموں پر عش عش کرتے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہے یہ سعادت ان کو کہاں اور کیسے نصیب ہوئی معملِ سائنس۔ کارخانے۔ کالج تجارت گاہیں۔ صناعت وصفت۔ میدان جنگ۔ ایوانہائے سیاست یہ فضائے بسیط اور وہ تمام مقامات جہاں نوامیسِ فطرت پر قدرت پانے کے لیے انسان منہمک و مشغول ہے یہ سب انھیں خیالات کا کرشمہ ہے جو ایک شاعر کے دماغ میں پیدا ہوئے۔ شاعر صرف وہ نہیں جو کلام موزوں کر سکتا ہے بلکہ شاعر صرف وہ ہے جو انسانی مستقبل اور اس کے امکاناتِ عمل پذیری پر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شدت کے ساتھ وقوف پاتا ہے۔ وہ یہ دریافت کرتا ہے کہ انسان کہاں تک فطرت کو برافگندہ نقاب کر سکتا ہے اور کہاں تک فطرت سے ہمکنار ہو سکتا ہے وہ منتہائے منزل کا پتا دیتا ہے ہم آپ صرف منازلِ سفر طے اور متعیّن کرتے ہیں۔

حضرات۔ میں شاعر اور شاعری کو کس نگاہ سے دیکھتا ہوں اس کا ایک مجمل خاکہ پیش کر چکا ہوں پھر یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ہم نے اپنے معزز مہمان شعرا کو انھیں توقعات کے ساتھ مدعو کرنے کی عزت حاصل کی ہے۔ وہ ہمارے نوجوانوں کے رہبر بنیں۔ وہ ان کو بتائیں کہ فطرت کا ان سے کیا مطالبہ ہے

اور وہ اس مطالبے سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کے فرائض متعدد اور مختلف ہیں، اور یہ اختلاف قومی۔ سیاسی۔ معاشرتی ضروریات کی بنا پر ہیں۔ میں جانتا ہوں یہ اختلافات اسی وقت تک اختلافات کی حیثیت رکھتے ہیں جب تک ہم کو یہ نہ معلوم ہو کہ ان کے علاوہ ایک طریقۂ عمل ایسا بھی ہے جو ہر قوم ہر ملک اور ہر زمانہ کے لیے یکساں ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ طریقۂ عمل ہمارے شعرا ہمارے نوجوانوں کو بتائیں۔ میرا خیال ہے یہ صرف شعرا ہیں جو اس پیغام کو اس طرز پر پہنچا سکتے ہیں کہ ہمارے نوجوانوں کو زندگی کے مختلف نشیب و فراز میں پھر کبھی فراموش نہ ہو۔ اور اس پیام کی تعمیل ان کے لیے اختیاری نہیں بلکہ اضطراری بن جائے میں جانتا ہوں یہ ایک مشکل کام ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ہم کو اپنے معزز شعراء اور مہمانوں کو زحمت دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

حضرات۔ جس شعر اور شاعر کا میں نے ذکر کیا ہے یہ وہی ہیں جن کی طرف رسول مقبول صلعم نے اپنی زبان مبارک سے اشارہ فرمایا ہے إِنَّ لِلّٰهِ خَزَائِنَ تَحْتَ الْعَرْشِ وَمَفَاتِيحُهَا أَلْسِنَةُ الشُّعَرَاءِ یعنی عرش کے نیچے اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں جن کی کنجیاں شعرا کی زبانیں ہیں۔ اس حدیثِ نبوی سے صاف پتا چلتا ہے کہ شعرا اپنے اندر غیر معمولی اثر رکھتا ہے۔ اور گو شعر گوئی کے متعلق اختلاف رہا ہے لیکن شعر کے معجز نما اثر سے حامی اور مخالف کسی کو انکار نہیں ہوا اور یہ اختلاف بھی شعر کہنے والوں ہی کے متعلق رہا فنِ شعر گوئی پر سب متفق ہیں۔ کلام پاک میں بھی فنِ شعر کی مذمت نہیں ہے بلکہ شعرا کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کے پیرو گمراہ ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو نیک اور صالح ہیں۔ اکثر حکما نے نظم کو نثر پر ترجیح دی ہے چنانچہ رشیدی جو صوفی بھی تھا اور شاعر بھی وہ کہتا ہے:

سخن گرچہ منثور نیکو بود — چو منظوم گردد نکوتر بود
بگوہر ہمی بنگری تا آزموں — کہ بے رشتہ چون ست وبا رشتہ چوں

حضرات۔ آج اور کل کے پروگرام سے ہم سب واقف ہیں۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ اس پروگرام کی ترتیب میں کسی قدر تنوع سے کام لیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے اس تنوع کو آپ پسند فرمائیں گے۔ مصرعِ طرح

کو نظر انداز کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے شعراء کو ردیف و قافیہ یا بحر کی دقت نہ پیش آئے اور وہ اپنے بہترین خیالات کا سہولت اور آزادی کے ساتھ اظہار فرما سکیں مصرعِ طرح کا مقرر کرنا ہم لوگوں کے لیے کچھ تکلیف دہ اور فرسودہ تھا کیونکہ اس قسم کا پرچۂ امتحان دینا اور جوابات کا پڑھنا تو ایک طور پر ہماری عادت اور پیشے میں داخل ہو گیا ہے اور وہ زمانہ قریب ہے جب ہم میں سے ہر ایک اسی آشوب میں مبتلا ہوگا۔

حضرات۔ اس مشاعرے کا امتیازِ خصوصی یہ بھی رہا ہے کہ کارکنانِ مشاعرہ ہر سال ایک انعامی نظم کا اعلان کرتے رہے ہیں اور اس کے لیے کوئی نہ کوئی عنوان بھی مقرر کر دیا جاتا تھا۔ توقع یہ تھی کہ اس طرز پہ ہر قومی اور ملکی ضرورت کی طرف ابنائے ملت اور ابنائے وطن کو متوجہ کرنے میں سہولت ہوگی اور اگر ایک طرف ہماری قومی شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوگا تو دوسری طرف یہی بزمِ مشاعرہ اس قسم کی تحریکات کے لیے محرکِ اعظم ثابت ہوگی۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ اب تک اس مقصد کے حصول میں ہم کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے چنانچہ اس سال بھی میں دیکھتا ہوں کہ عنوانِ مقررہ پر صرف دو ایک نظمیں موصول ہوئیں نظر برآں میں سوچتا ہوں کہ آیندہ سے یہ انعامی مقابلہ بالکل عام کر دیا جائے اس وقت مجھے امید ہے ہمارے شعرائے ہمارے مقاصد کی تکمیل میں ہماری اعانت فرمائیں گے۔

اس کے بعد تمثیل کا ذکر کروں گا۔ ہماری اردو شاعری ایک حد تک درباری شاعری رہی ہے۔ دربار ہی میں اس کی بنا پڑی دربار ہی میں یہ پھلی پھولی اس لیے بے محل نہ ہوگا اگر آج ہم اس اصل کی نقل دیکھ لیں اور اندازہ کریں کہ اب ہم کو کیا کرنا چاہیئے۔ میں اس سلسلہ میں کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتا ہاں اس کے بعد میری آنکھیں اُس مجمع اُس شاعر اور اُس فضا کو ڈھونڈیں گی جو عرب میں نظر آتا تھا۔ خدا کو منظور ہے تو آیندہ سال ہم عکاظ کی شعر خوانی کا منظر آپ کے سامنے پیش کر سکیں گے اور میں استدعا کرتا ہوں کہ ہمارے محترم شعرا اس موقع کے لیے ہم کو ایسی مختلف و متعدد نظمیں مرحمت فرمائیں گے جس سے عکاظ کا وہ قدیم نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے۔

آخر میں میں اپنے طلبا سے کہوں گا کہ وہ اس موقع کی اہمیت کا احساس کریں اور اپنے قول و عمل سے اس کا ثبوت ہم پہنچائیں کہ ہم ہر قسم کی دقتوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنے مہمانوں کا احترام کرتے ہیں۔ ہم نے

اپنے مہمانوں کو تکلیف دی ہے اس لیے ہم کو بھی تکلیف سہنے کے لیے آمادہ رہنا چاہیے۔ ممکن ہے آپ پورے طور پر اشعار نہ سن سکیں۔ ممکن ہے آپ اشعار پسند نہ کریں۔ ممکن ہو آپ کو معقول نشست نہ ملی ہو۔ ممکن ہو آپ کے بعض جذباتِ تفریحی آپ کو نچلا نہ بیٹھنے دیتے ہوں لیکن یہ ناممکن ہونا چاہیئے کہ آپ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جس سے آپکی آپ کے پرنسپل اور اساتذہ کی آپ کے کالج کی اور آپ کے تعلیم گاہ کی تضحیک و تذلیل ہو۔ بجائے اس کے کہ آپ ہمیشہ کے لیے بدنام ہوں یا اس تعلیم گاہ کو بدنام ہونے دیں یہ کہیں بہتر ہے کہ آپ اس تقریب کی بعض معذوریوں کو جھیل لیں۔ آپ یقین جانئیے اگر آپ نے اپنے نفس پر یہ جبر کر لیا تو آپ کو اس سے کہیں زیادہ لطف آئے گا جو کسی اچھے مقام پر بیٹھکر آرام سے کلام سننے میں آسکتا تھا۔

میرے عزیزو یہ میری آخری بات غور سے سن لو

اسلام کا مسلک قربانی ہے اور اسلام اپنے ہر فرزند سے اس کا مطالبہ کرتا ہے آخر میں میں پھر اپنے مہمانانِ مکرم۔ شعرائے محترم اور دیگر بزرگانِ قوم کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اپنی ہی طرف سے نہیں بلکہ اپنے طلبا اور اساتذہ کی طرف سے بھی مجھے امید ہے ہمارے عزیز طلبا کو اپنے جذبۂ احترام و تشکّر کے اظہار کا یہ بہترین موقع ثابت ہوگا۔ خدا حافظ

مشاعرہ رامپور سنہ ۱۲۹۵ھ
۱۸۷۸ء

جس کی تمثیل ۸ دسمبر ۱۹۲۹ء کو انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہوئی

اسماء و ترتیب شعرائے اصل و نقل

نمبر	اصل	نقل	عمر
۱۷	[illegible]	[illegible]	عمر ۲۸ سال
۱۶	[illegible]	[illegible]	عمر ۵۹ سال
۱۵	[illegible]	[illegible]	عمر ۴۸ سال
۱۴	[illegible]	[illegible]	عمر ۵۷ سال
۱۳	[illegible]	[illegible]	عمر ۳۵ سال
۱۲	[illegible]	[illegible]	عمر ۱۹ سال
۱	امیر مینائی [illegible]	[illegible]	عمر ۵۱ سال
۲	[illegible]	[illegible]	عمر ۵۱ سال
۳	[illegible]	[illegible]	عمر ۲۵ سال
۴	[illegible]	[illegible]	عمر ۱۴ سال
۵	[illegible]	[illegible]	عمر ۳۵ سال
۶	[illegible]	[illegible]	عمر ۷۰ سال
۷	[illegible]	[illegible]	عمر ۳۰ سال
۸	غنی لکھنوی شاگرد منیر	شبیر احمد	عمر ۲۵ سال
۹	احسان رامپوری شاگرد داغ	اختر امام	عمر ۳۳ سال
۱۰	بشیر رامپوری شاگرد داغ	ظفر احمد فاروقی	عمر ۳۳ سال
۱۱	شیخ امداد علی بحر لکھنوی شاگرد ناسخ	منیر حسین	عمر ۶۰ سال
۱۸	[illegible]	[illegible]	عمر ۳۳ سال
۱۹	[illegible]	[illegible]	عمر ۱۸ سال
۲۰	[illegible]	[illegible]	عمر ۵۵ سال
۲۱	[illegible]	[illegible]	عمر ۴۵ سال

داستان گو ... میں پوپلا پن تھا

یہ غزل نہیں پڑھتے تھے

سب سے پہلے نواب کلب علی خاں بہادر والئ رام پور

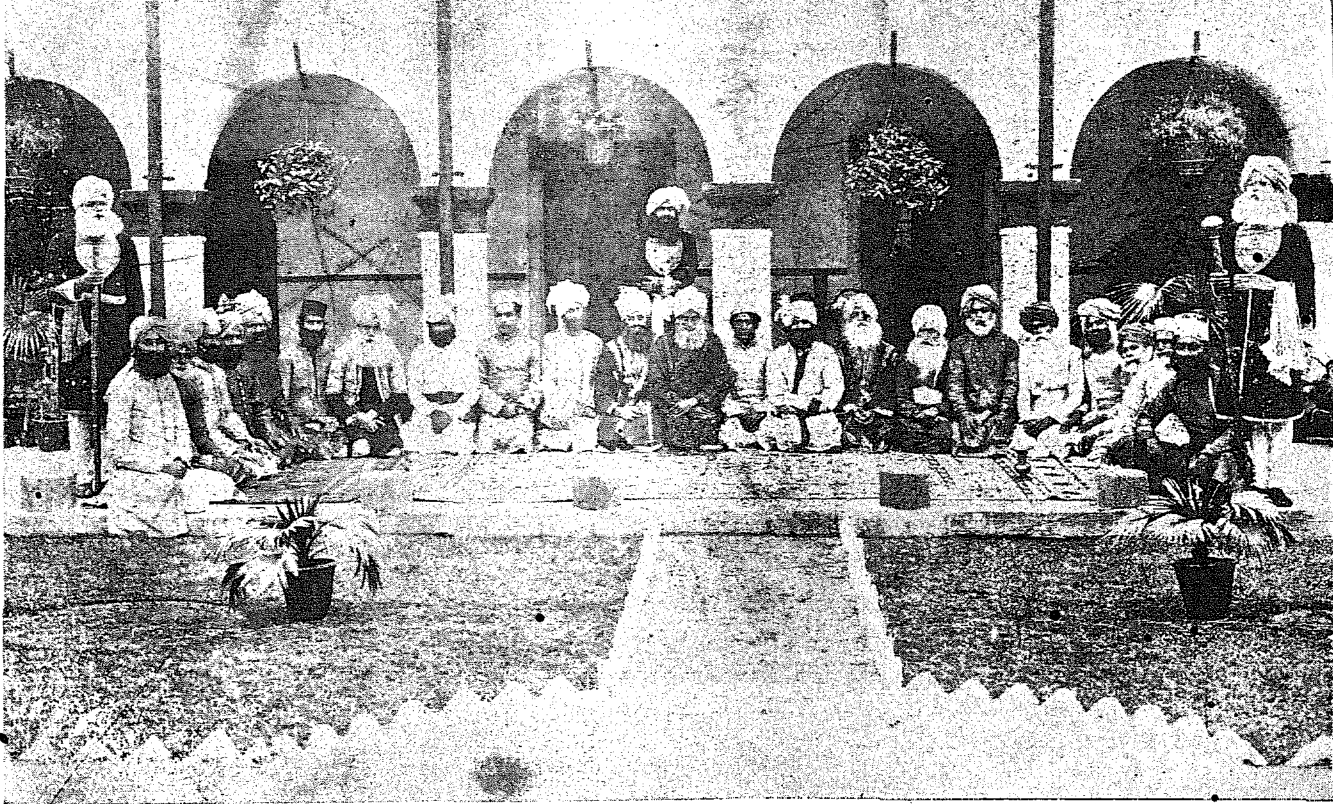
کی غزل

چوبدار لے کر آئے گا اور میر مشاعرہ امیر مینائی جو ان کے استاد تھے

اس غزل کو پڑھیں گے

عبدالسلام متعلم کلاس نہم و عبدالسمیع و عبدالقیوم متعلمان کلاس یازدہم مصاحب اور چوبدار بن کر آئے۔

بوجہ ضعیفی خود غزل نہیں پڑھتے تھے ان کی غزل ... پڑھیں گے



بائیں جانب سے بیٹھے ہوئے — (۱) اسرار علی خاں (شاگرد بحر) (۲) مشیر حسین (بحر) (۳) ظفر احمد فاروقی (بشیر رامپوری)
(۴) اختر امام (احسان لکھنوی) (۵) سید شبیر احمد (غنی لکھنوی) (۶) گوہر علی ( ) (۷) ظہور الحق (قلق)
(۸) اظہار احمد (سحاب) (۹) منیر الدین قدوائی (قمر مینائی) (۱۰) سبط احمد ( ) (۱۱) زوار علی (مولانا عبدالحق منطقی خیر آبادی)
(۱۲) سید محمد عارف فاطمی معتمد (امیر مینائی صدر مشاعرہ) (۱۳) اطہر علی کرمانی (ناداں) (۱۴) مشرف حسین (اشک)
(۱۵) ظفر احمد صدیقی (امیر اللہ تسلیم) (۱۶) معز الدین (اسیر دہلوی) (۱۷) شمس السلام (عروج) (۱۸) طاہر حسین زبیری
(حیا گرگانوی) (۱۹) محمد واصل (شاغل دہلوی) (۲۰) مقبول الرحیم (منیر شکوہ آبادی) (۲۱) ولی الحق (جلال لکھنوی)
(۲۲) شیخ محمد عمر (داغ دہلوی)
...جانب سے کھڑے ہوئے — (۱) عبدالقیوم صدیقی (چوبدار) (۲) عبدالسلام ہاشمی (مصاحب) (۳) عبدالسمیع صدیقی (چوبدار)

تمثیلی مشاعرے کی غزلیں

جن کو

مختلف طلبہ نے

اصل شعرا کا نمایندہ بن کر اُن کی وضع و قطع میں پڑھا

نام و احوالِ اصل شاعر

نواب:- خلد آشیاں نواب محمد کلب علی خاں بہادر والی رامپور دہلی و لکھنؤ کی سلطنتوں کے مٹنے کے بعد آپ کا دربار قدردانیِ شعرا و کملا کے لیے مشہور و معروف ہے آپ کی وفات سنہ ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء میں واقع ہوئی سنہ ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء میں یعنی جس سنہ کا یہ تمثیلی مشاعرہ ہے اُن کی عمر ۴۶ سال کی تھی۔

نواب صاحب خود مشاعرے میں تشریف نہیں لاتے تھے۔ اُن کی غزل حسب آدابِ شاہی مصاحب لیکر آتے اور میر مشاعرہ (امیر مینائی) پڑھتے تھے۔ چنانچہ غزل مندرجۂ ذیل کو ایک مصاحب اور دو چوبدار جن کی نمایندگی عبدالسلام متعلم کلاس دہم اور عبدالسمیع صدیقی و عبدالقیوم متعلمان کلاس یازدہم انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی نے کی، اسی قاعدے سے لائے اور میر مشاعرہ نے بہ تعظیم اُس کو لیا غزل پڑھنے سے پہلے میر مشاعرہ نے باین الفاظ تقریر کی

حضرات! یہ غزلِ مبارک جس کو حضور پُر نور فیض گنجور تاجِ اُبہت و شہریاری یاقوتِ اکلیلِ مملکت و تاج داری دولت پناہی والا جاہی، ہمارے آپ کے آقائے ولی نعمت فلک رفعت خلد اللہ ملکہ وسلطنتہٗ نے بنظر ذرّہ نوازی بھیجی ہے، اس کے پڑھنے کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں، امید کہ بصد آداب آویزۂ گوشِ سراپا ہوش بنایا جائے:-

غزل

پھر خدا جانے ملے کب درِ جاناں مجکو — دیکھ لینے دے ذرا دیدۂ گریاں مجکو
میں بھی ہنستا ہوں بہت آپ کی دانائی پر — آپ ہنس ہنس کے بناتے ہیں جو ناداں مجکو
خاک دیکھوں گا شبِ وصل، کہ قسمت سے مری — موت کا بھی نظر آتا نہیں ساماں مجکو
اُٹھ کے دشمن ہی کی آنکھوں میں پڑوں گا ہمدم — خاک کر دیگی اگر گردشِ دوراں مجکو
تم نے ارمان مرے دل کے جو پوچھے مجھ سے — کیا بتاؤں نہ رہا اب کوئی ارماں مجکو
یار آتا ہی، تصدق کے لیے اے واعظ! — دے ذرا بہرِ خدا اپنا بھی ایماں مجکو

وہ اُٹھائے ہیں مزے ہجرِ صنم میں نواب
کہ نہیں وصل کی خواہش شبِ ہجراں مجکو

(۱)

امیر: مفتی منشی امیر احمد، مینائی، میرِ مشاعرہ۔ ولادت ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء بمقام لکھنؤ۔ وفات ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء بمقام حیدرآباد دکن۔ مشاعرے کے وقت ۷۱ سال کی عمر تھی۔ آپ دارالریاستہ رام پور میں عہدۂ مفتی پر فائز، اور فنِ سخن میں نواب خلد آشیاں کے اُستاد تھے۔ سرکاری مشاعرے آپ ہی کی صدارت میں ہوا کرتے تھے۔ بلحاظ وضع و قطع، صورت و شکل، قد و قامت تقریباً یہی حالت تھی جو مرقعِ مطبوعہ کے نمبر (۱) میں دکھائی گئی ہی۔ رنگ گورا تھا اور اُس زمانے میں قریب قریب دُہرے بدن کے تھے۔ پڑھنے کا انداز سیدھا سیدھا۔ آواز متوسط جس میں متانت اور نرمی تھی۔ آپ کی نمایندگی کا فرض سید محمد عارف فاطمی ملیح آبادی متعلم درجۂ دوازدہم انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و سکریٹری انجمن خیابانِ اُردو نے ادا کیا۔ غزل پڑھنے سے پہلے مفہومِ انکساری کو ذیل کے الفاظ میں ظاہر کیا:۔

اگرچہ حضورِ پُر نور کی غزلِ بے بدل کے بعد کسی کو اپنی غزل کے پڑھنے کی جرأت نہیں ہو سکتی لیکن مجلسِ مشاعرہ کا انعقاد مجبوراً اس جسارت پر مجبور کرتا ہے، اس لیے اپنے ہفوات و ہملات کے عرض کرنے کی

اجازت چاہتا ہوں۔

جواباً سامعین و حاضرینِ مشاعرہ نے بسم اللہ، بسم اللہ کی صدائیں بلند کیں، اور جواب الجواب میں میر مشاعرہ نے الاَمرُ فَوقَ الاَدَب کہکر غزل شروع کی:۔

غزل

جیتے جی جان سے گزرتے ہیں ۔۔۔ مرنے والے پہ ہم تو مرتے ہیں
کچھ نہ پوچھو کہ ہاتھ خالی ہے ۔۔۔ ہم تو دن زندگی کے بھرتے ہیں
دل ٹھہر جائے یہ اُمید نہیں ۔۔۔ ایسے بگڑے کہیں سنورتے ہیں
کس سے چوری اگر خدا سے نہیں ۔۔۔ سچ ہے زاہد اتہوں پہ مرتے ہیں
لکھتے ہیں خط جو وہ رقیبوں کو ۔۔۔ روز پرچے ہمیں گزرتے ہیں
مل گیا گھاٹ تیغِ قاتل کا ۔۔۔ اب کوئی دم میں پار اُترتے ہیں

چاہتے ہیں تو اک نظر میں امیرؔ
ہر ذرّے کو بھی وہ کرتے ہیں

(۳)

شمس العلما مولوی عبد الحق منطقی خیر آبادی۔ ولادت ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء بمقام دہلی۔ وفات ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء مقام خیر آباد ضلع سیتا پور۔ شاعر نہ تھے مگر اعلیٰ پائے کے سخن دوست اور شعر پسند تھے۔ جناب امیر مینائی سے بے حد راسم و خصوصیات تھیں قریب قریب سب مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، اُن کی عظمتِ علمی اور وقارِ مذہبی کا اثر سب پر یکساں تھا، بنہایت انصاف پسند اور نہایت صاف گو تھے۔ مثلاً ایک مشاعرے میں مرزا داغ نے یہ مطلع پڑھا۔

یہ تری چشمِ فسوں گر میں کمال اچھا ہے ۔۔۔ ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

اُن کے بعد جب جلالِ لکھنوی نے اپنی غزل کا یہ شعر پڑھا:۔

دل مرا، آنکھ تری، دونوں ہیں بیمار۔ مگر ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

تو اس شعر کو سُن کر مولانا نے فوراً مرزا داغ سے بر سرِ مشاعرہ کہا کہ نواب مرزا خاں تم اپنا شعر نکال دو۔ یہ قافیہ اور یہ مضمون جلال کا ہو گیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ منشی محمد احمد صاحب قمرؔ خلف اکبر جناب امیر مینائی، جن کی عمر اُس وقت ۱۲-۱۴ برس کی تھی اپنی غزل پڑھ رہے تھے۔ پڑھنے کا ڈھنگ دل کش اور پسندیدہ تھا جنابِ جلال نے دل افزائی کے لیے نیز بہ خیال کر کے کہ یہ بچہ خود تو کیا کہتا ہوگا صرف اُن کے پڑھنے کی تعریف بایں الفاظ کی کہ واہ صاحبزادے خوب پڑھتے ہو۔ مولانا نے اس داد کے انداز کو اور جلال کی افتادِ مزاج کو دیکھکر فرمایا کہ "جناب پڑھنے کے ساتھ کہتے بھی خوب ہیں"

۱۲۹۵ھ ۱۸۷۸ء میں ان کی عمر ۵ سال کی تھی۔ قد پورا تھا اور سرخ سفید رنگ تھا۔ ڈاڑھی گھنی ہوئی نہایت خوبصورت تھی جو سرخ خضاب سے اور زیادہ بھلی معلوم ہوتی تھی لباس میں چپکنؔ۔ عمامہ۔ برکا پاجامہ اور کامدار جوتہ ہوتا تھا۔ پالکی پر آیا کرتے تھے اور جناب امیر مینائی کے گھر مشاعرے سے پہلے آ جاتے تھے، چوں کہ مشاعرہ منشی صاحب کے مکان سے قریب ہی ہوتا تھا اس لیے وہاں سے انھیں کے ساتھ رونق افروزِ مشاعرہ ہوتے

اس تمثیل میں اُن کی نمایندگی سید ذوالحسین رئیس جانسٹھ ضلع مظفر نگر متعلّم درجہ دوازدہم نے کی جن کی بہترین تمثیل پر جج صاحبوں نے تمغا تجویز کیا۔

(۳)

کاوش ۔ محمد شاہ خاں ولد مبارک شاہ خاں ساکن رام پور، شاگرد میر ضامن علی جلال لکھنوی ۱۲۹۵ھ میں ۲۰ برس کی عمر تھی، ان کی تمثیل سبط احمد متعلّم کلاس یازدہم انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی نے ادا کی۔

غزل

بغل میں اُس کی رہ کر دل ہمارا ہو نہیں سکتا
کہ اپنا ہو کے بیگانہ ۔ پھر اپنا ہو نہیں سکتا

؎ چپکن ایک قسم کی قبا اور بالابر کے انگرکھے کو کہتے ہیں جس کا سینہ کھلا ہوا ہوتا ہے۔ اور برکا پاجامہ ڈھیلے پائنچے کے پاجامے کو کہتے ہیں گذشتہ عہد میں ثقہ لباس سمجھا جاتا تھا۔ ۱۲

تری اٹکھیلیوں کی چال جو آفت اُٹھاتی ہے — قیامت سے بھی ایسا فتنہ برپا ہو نہیں سکتا
بہت پچتاؤ گے دیکھو ملا کر خاک میں ہم کو — پھر ایسا عاشقِ جاں باز پیدا ہو نہیں سکتا
جو ہم کہتے ہیں تم مانو جو تم کہتے ہو ہم مانیں — بہم فیصل یہ کیا الفت کا جھگڑا ہو نہیں سکتا
جِلا سکتے نہیں کشتوں کو اُن کے آ کے عیسیٰ بھی — جسے حسرت نے مارا ہو وہ زندا ہو نہیں سکتا
کسی کا ناز سے کہنا عیادت کو مری آ کر — ہر اک مرتے ہوئے کا میں مسیحا ہو نہیں سکتا

دلِ خانہ خراب الفت میں جو چاہے کرے کاوش
کوئی اپنی خوشی سے آپ رسوا ہو نہیں سکتا

(۴)

قمر۔ حافظ منشی محمد احمد صاحب خلف اکبر جناب امیر مینائی ولادت ۱۲۸۰ھ ۱۸۶۳ء موجود فرماں روائے رام پور کے اُستاد ہیں۔ اور اب قمر کی جگہ صریر تخلص فرماتے ہیں۔ اور ریاست رام پور میں موجود ہیں سنہ ۱۲۹۵ھ میں ۱۵-۱۶ برس کی عمر تھی۔

آپ کی غزل منیر احمد قدوائی متعلم درجۂ دوازدہم انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی نے پڑھی۔

غزل

شوق اُن کو جو ہوا انجمن آرائی کا — درِ مقصود کھلا چشمِ تماشائی کا
گُم کیا عشق نے ایسا کہ نہیں ملتا اب — لامکاں میں بھی پتا آپ کے شیدائی کا
غضب آیا جو گریبانِ سحر چاک ہوا — چھٹ گیا ہاتھ سے دامن شبِ تنہائی کا
آئینہ دیکھتے ہی شرم و حیا آتی ہے — عکس پر بھی ہے گماں اُن کو تماشائی کا
ہوں وہ بیمار کہ فرقت میں مرے پاس اجل — آئی ہے اوڑھ کے بُرقع شبِ تنہائی کا
دل مرا مجکو لیے پھرتا ہے جنگل جنگل — چین کیا خاک ملے ساتھ ہے سودائی کا

کیوں نہ مدہوش رہوں بادۂ عرفاں سے قمر
ہوں میں فرزند امیر احمد مینائی کا

(۵)

سحاب ۔ نصیر احمد خاں ولد محمد سعید خاں، ساکن رامپور سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی کے شاگرد رشید تھے اور اکثر اُن کے ساتھ مشاعروں میں رہا کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۹۵ھ میں ۲۶-۲۷ برس کی عمر تھی۔ سپاہیانہ وضع رکھتے تھے۔ سرخ و سفید رنگ تھا، چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور قد متوسط تھا۔ غزل پڑھنے کا انداز معمولی تھا اُن کا کلام اظہار الدین متعلم درجۂ یازدہم انٹرمیڈیٹ کالج نے پڑھا :-

غزل

کوچۂ یار میں یوں عاشقِ ناشاد رہے | شہر آباد میں جیسے کوئی برباد رہے

بعد میرے نہ رہا ایک بھی جاں باز وں میں | کس پر اب دست بقبضہ کوئی جلاد رہے

پہلوئے غیر نہ ڈھونڈھے نہ پھرے آوارہ | چین سے دل میں مرے ناوکِ بیداد رہے

کرتے پھرتے ہیں ترے تیرِ نگہ جا سوسی | کس جگہ بچ کے دلِ عاشقِ ناشاد رہے

نہیں رہتی ہے خوشی دل میں تو حیرت ہی سہی | کسی صورت سے یہ ویران گھر آباد رہے

زخمِ شمشیرِ تغافل کوئی کب تک کھائے | روز تجدیدِ ستم او ستم ایجاد رہے

خاک چھانا کیے ہم کوچۂ الفت میں سحابؔ
مثلِ نقشِ قدم اس راہ میں برباد رہے

(۶)

قلق ۔ خواجہ ارشد علی خاں نام، خواجہ اسد عرف، ابن خواجہ بہادر حسین متخلص بہ فراق، واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے مصاحبِ خاص اور شیخ ناسخ مرحوم و خواجہ وزیر مغفور کے شاگرد رشید تھے، دربار اودھ سے یار السلطان آفتاب الدولہ مہر الملک شمس جنگ خطاب پایا تھا۔ سنہ ۱۲۹۵ ہجری میں ستر برس کی عمر تھی۔ ان کی غزل قاضی ظہور الحق متعلم کلاس دوازدہم انٹر کالج مسلم یونیورسٹی نے پڑھی۔ قلق کا رنگ گورا، جسم ذرا نحیف، ڈاڑھی سفید اور آواز پست تھی۔

غزل

نگہ بھر سے دیکھو جو ذرا تم مجھکو، آنکھ کا تارا سمجھنے لگیں مردم مجھکو
آشنا چیں کی مروت سے نہیں آنکھ اصلا اسی بے دید سے، اور چشم ترحم مجھکو
نشے میں عالم بالا کی بھی کچھ دیکھوں سیر ساقیا آج تو دے دُردِ تہِ خم مجھکو
بھائی اللہ کو موسیٰ کی زباں کی لکنت بھاتا ہے یار کا ہکلا کے تکلم مجھکو
کہتے ہیں کچھ ترس اور وہ تو آجاتا ہے کچھ تجھی پر نہیں آتا ہے ترحم مجھکو
ناتواں ہوں نہ جتا زور تو اے بحرِ سرشک ایک قطرہ بھی ڈبونے کو ہے قلزم مجھکو

ہے وہ نازک دمِ تقریر گلے سے اُس کے
نظر آتے ہیں قلق حرفِ تکلم مجھکو

(۷)

محمود - محمود علی خاں نام، ساکن رام پور۔ مرزا داغ کے شاگرد۔ چھریرا بدن۔ رنگ صاف۔ آواز متوسط ۱۲۹۵ سنہ ہجری میں ۳۰ سال کی عمر تھی۔ ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ ان کی غزل گوہر علی متعلم کلاس دوازدہم انٹر کالج مسلم یونی ورسٹی نے پڑھی۔

غزل

کیوں میرا یقیں اے دلِ مضطر نہ ہوا تھا تو اُن پہ فدا سوچ سمجھکر نہ ہوا تھا
جو آج تمہیں دیکھ کے دل کی ہوئی حالت ایسا یہ کبھی آپ سے باہر نہ ہوا تھا
انکار نے تیرے مجھے مارا ہے ستمگر ورنہ ابھی وعدہ تو برابر نہ ہوا تھا
دیکھا تھا نہ جب تک ترے عشاق کا مجمع میں قائلِ ہنگامۂ محشر نہ ہوا تھا
آغازِ محبت میں شرارت کا کسی کی کیا تجکو یقیں اے دلِ مضطر نہ ہوا تھا

وہ کوس کے دینے لگے دشنام بھی مجکو　　حاصل یہ کبھی قندِ مکرّر نہ ہوا تھا

کہنے کو تو یوں قیس بھی تھا عشق میں بدنام
محمودؔ، مگر تیرے برابر نہ ہوا تھا

(۸)

غنیؔ - آغا علی نقی لکھنوی - شاگرد منیرؔ شکوہ آبادی - کالا رنگ - چہرے پر چیچک کے داغ - متوسط جسم ڈاڑھی منڈی ہوئی - مونچھیں ذرا بڑی - اونچی آواز - اور پڑھنے کا انداز بہت بانکا ترچھا تھا۔ ۱۲۹۵ھ ہجری میں ۲۵ سال کی عمر تھی۔ شبیر احمد متعلم کلاس دوازدہم انٹر کالج مسلم یونیورسٹی نے اُن کے یہ شعر پڑھے :-

غزل

غیرت تو محبت میں ذرا بھی نہیں آتی　　مرجانے کی جا ہے کہ قضا بھی نہیں آتی

کیا جانئے ترے بام پہ اے جان ہے کیا لطف　　جاتی ہے تو پھر آہِ رسا بھی نہیں آتی

دل سا متحمل نہیں دیکھا نہیں دیکھا　　سو مرتبہ ٹوٹے تو صدا بھی نہیں آتی

بے صبریوں سے گریہ وزاری نہیں جاتی　　رونا تو یہ ہے تم کو جفا بھی نہیں آتی

(۹)

احسانؔ - احسان علی خاں نام، وطن رامپور - شاگرد مرزا داغؔ - سانولا رنگ - قد متوسط - ڈاڑھی چھوٹی - وضع قطع پرانی ۱۲۹۵ھ ہجری میں ۳۰ سال کی عمر تھی - آواز پست مگر متین - سید اختر امام متعلم کلاس یازدہم انٹر کالج مسلم یونیورسٹی نے اُن کی غزل پڑھی :-

غزل

گم ہوئے آپ میں جب تک نہ وہ جلوا دیکھا　　ہوئے بے خود تو خدائی کا تماشا دیکھا

اُف رے بالیدگیِ قطرۂ اشکِ حسرت　　آنکھ سے گرتے ہی ہم نے اُسے دریا دیکھا

بن گیا آئینہ میرے لیے سارا عالم　　اُٹھ گئی آنکھ جدھر یار کا جلوا دیکھا

ذبح پہروں میں کیا کُند چھری سے مجھکو — گھڑیوں پھر میرے تڑپنے کا تماشا دیکھا

قطعہ

لائی تاثیر محبت اُنھیں میت پہ مری — کھول کر بند کفن سے مرا چہرا دیکھا

منھ پہ منھ رکھ کے بصد درد یہ رو کر بولے — پیار اخلاص وہ سب آپ کا جھوٹا دیکھا

بے ملے چل دیئے افسوس بڑی جلدی کی
میرے آنے کا بھی احسان نہ رستا دیکھا

(۱۰)

بشیر۔ محمد بشیر خاں نام۔ رام پور وطن۔ مرزا داغ کے شاگرد۔ بالکل اَن پڑھ تھے، مگر غزل خوب کہتے تھے سپاہیانہ وضع، کمر میں اکثر تلوار لٹکی رہتی تھی۔ تیراکی میں مشّاق تھے، رنگ گورا۔ قد درمیانی۔ بدن چھریرا چھوٹی ڈاڑھی ۱۲۹۵ھ ہجری میں ۳۵ سال کی عمر تھی۔ آخر عمر میں حیدرآباد دکن چلے گئے تھے وہیں انتقال کیا۔ آواز میں کڑک اور پڑھنے کی ترکیب دل کش تھی۔ ظفر احمد فاروقی متعلم کلاس یازدہم انٹر کالج مسلم یونیورسٹی نے اُن کے ۳ شعر پڑھے۔

غزل

بتوں کو بے وفا تو نے بنایا کیا وفا کم تھی؟ — کمی کس کی تھی کیا شے تیرے گھر میں اے خدا کم تھی

نگاہِ غور سے دیکھا تو یہ دونوں برابر تھیں — نہ فرقت تھی قضا سے کم نہ فرقت سے قضا کم تھی

بنایا آسماں بھی اور اک بہرِ ستم تو نے — الٰہی تیرے بندوں پر بتوں کی کیا جفا کم تھی

(۱۱)

بحر۔ شیخ امداد علی لکھنوی۔ شاگرد شیخ ناسخ مشہور اساتذہ میں تھے ۱۲۹۵ھ ہجری میں ۷۰ سال کی عمر تھی رنگ گندمی۔ ڈاڑھی سفید اور چھوٹی۔ وضع قطع بالکل پرانی۔ ڈھیلا پاجامہ لمبا کرتہ، اس پر انگرکھا یا چپکن اور پاؤں میں لکھنؤ کی گفشیں پہنتے تھے۔ آواز میں رعشہ تھا اس لیے غزل خود نہیں پڑھتے تھے۔ ان کی نمائندگی منیر حسین متعلم کلاس دوازدہم انٹر کالج مسلم یونی ورسٹی نے کی اور غزل اسرار علی خاں متعلم دوازدہم کلاس سے پڑھوائی گئی

غزل

اے جذبِ عشق کاش وہ گُل کھلا چمن میں
پیدا ہو رنگِ بلبل ہر گُل کے پیرہن میں

دیکھی ہے جب سے اُس کے رخسار کی صباحت
لالے ہیں آبرو کے نسرین و نسترن میں

زلفیں بکھر گئی ہیں اندھیر ہو گیا ہے
بالوں میں منھ چھپا ہے یا چاند ہے گہن میں

اے خارِ دشتِ وحشت چھوڑو ہمارا دامن
لے آئیں اپنے دل کو بھول آئے ہیں وطن میں

دیکھیں جنوں کدھر کی دکھلائے سیر ہم کو
گلشن میں گل کھلے ہیں پھولا ہے ڈھاک بن میں

تقریرِ یار سے کیا سلکِ گہر کو رتبہ
مشتاقِ گوشِ دل ہے وہ بات ہے سخن میں

بحر اپنا حال دیکھو شدّت سے رو رہے ہو
تنکے کا کیا بھروسا دریائے موجزن میں

(۱۲)

نادان۔ امراؤ مرزا ولد مرزا شاغل، برادر زادۂ مرزا داغ ۱۲۹۵ھ ہجری میں ۱۹ سال کی عمر تھی گٹھا ہوا بدن پستہ قد۔ سر پر بال۔ آواز ذرا باریک مگر اونچی۔ سانولا رنگ۔ مرزا داغ سے اصلاح لیتے تھے حیدرآباد دکن میں بھی اُن کے ساتھ رہتے تھے۔ وہیں انتقال کیا! اطہر علی کرمانی متعلم کلاس دوازدہم انٹر کالج مسلم یونیورسٹی نے ان کی غزل پڑھی۔

غزل

کہیں دکھلا رہی ہے تیغِ ابرو بانکپن اپنا
کہیں پھیلا رہی ہے جال زلفِ پُر شکن اپنا

مقامِ عشق کی ہم پہلی چوکھٹ اُس کو کہتے ہیں
جسے سمجھے عبادت خانہ شیخ و برہمن اپنا

جہاں گردی میں صورت آشنا جب کوئی ملتا ہے
نظر پڑتے ہی پھر جاتا ہے آنکھوں میں وطن اپنا

عجب سرکارِ حسن و عشق میں انصاف ہوتا ہے
مرے شیریں اڑائے خوں بہائے کوہکن اپنا

سبک ہوتا ہے ناداں آدمی اظہارِ مطلب سے
رہے جب تک کہ منھ میں لا کہ دمن کا ہے سخن اپنا

(۱۳)

اشک - میر قطب الدین نام - متوطن قصبۂ جلیسر ضلع ایٹہ مرزا داغ کے پرانے شاگردانِ رشید میں تھے مثنوی فریادِ داغ کی تصنیف سے پہلے جب مرزا صاحب کلکتے گئے تھے تو اشک بھی اُن کے ہمراہ تھے جیسا کہ فریادِ داغ کے اس شعر سے ظاہر ہے:-

میرے ہمراہ میر قطب الدین ۔۔۔ اشک ریزاں بحالتِ غمگین

حیدر آباد میں بھی اُستاد کے پاس چند سال تک مقیم رہے ۱۲۹۵ھ ہجری میں ۳۵ سال کی عمر تھی۔ پستہ قد۔ گورا رنگ۔ بلند آواز مگر جھرجھرائی ہوئی۔ متوسط ڈاڑھی۔ عمامہ اکثر باندھتے تھے۔ ستّر اور اسّی کے درمیان عمر پاکر چند سال ہوئے کہ اپنے وطنِ مالوف (جلیسر) میں انتقال کیا۔ مشرّف حسین متعلم کلاس یازدہم نے اُن کی غزل پڑھی:-

غزل

جگر میں تیر کو خنجر کو میرے دل میں رہنے دو ۔۔۔ مسافر کو ملے آرام جب منزل میں رہنے دو
ملے گا وہ تو قسمت سے مگر ہی دل لگی دل کی ۔۔۔ اُسے اُلجھا ہوا اس سعیِ بے حاصل میں رہنے دو
جو خوں آلودہ پیکاں ہے نکالو میرے سینے سے ۔۔۔ جو خوں آلودہ حسرت ہے وہ میرے دل میں رہنے دو
بھرے جاتے ہو ناحق شوق واریاں تم زبردستی ۔۔۔ جگہ کچھ شکر کو بھی سینۂ بسمل میں رہنے دو
وہ کہتے ہیں فرا کیا گر جو اب اک بار مل جائے ۔۔۔ تمنا اپنے دل کی کچھ کہو، کچھ دل میں رہنے دو
ہوا کھالیں کوئی دم اور بھی دنیا میں جنت کی ۔۔۔ ہماری لاش دم بھر کوچۂ قاتل میں رہنے دو

دمِ عرضِ تمنا اُن کا کہنا ہائے ہنس ہنس کر
قیامت تک اسے تم اشک اپنے دل میں رہنے دو

(۱۴)

تسلیم - منشی امیر اللہ لکھنوی، شاگرد نواب اصغر علی خاں نسیم دہلوی - دورِ آخر کے مشاہیر اساتذہ میں تھے۔ ۱۲۹۵ھ ہجری میں ، ۵ برس کی عمر تھی۔ قریہ اندام سیاہ فام ڈاڑھی نیچی اور سفید۔ آواز متوسط وضع لباس قدیم

اکثر عبا پہنتے تھے۔ پڑھنے کا انداز معمولی۔ ان کے انتقال کو ۲۰-۲۱ برس ہوئے۔
ظفر احمد صدیقی متعلم کلاس یازدہم نے اُن کی غزل پڑھی۔

غزل

نیند آتی تھی نہ کل جنھیں آغوشِ یار میں — وہ آج سو رہے ہیں اکیلے مزار میں
ناصح خطا معاف نہیں کیا بہار میں — ہم اختیار میں ہیں نہ دل اختیار میں
دیں گے حساب کیا دمِ محشر کہ عمر بھر — آئے نہ آپ ہم کبھی اپنے شمار میں
راہِ عدم میں شہرِ خموشاں جو مل گیا — اے مرگ رہ پڑے اُسی اُجڑے دیار میں
دل پر بھی اُن کے ڈر سے نہیں جبر کی مجال — اتنا بھی اختیار نہیں اختیار میں
مر کر بھی انقلاب کے صدمے جو یاد تھے — پہلو بدل سکے نہ کبھی ہم فزار میں

تسلیم ! مفلسی کی دم وزن منزلت
مانندِ حرفِ وصل نہیں اعتبار میں

(۱۵)

اسیر۔ سید مظفر علی۔ اصل وطن قصبہ امیٹھی بچپن سے لکھنؤ آ گئے تھے۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد اور امیر مینائی کے اُستاد تھے۔ نصیر الدین حیدر سے واجد علی شاہ کے عہد تک دربار شاہانِ اودھ کے میر منشی رہے اور وہیں سے تدبیر الدولہ مدبّر الملک بہادر جنگ خطابات پائے۔ سرکار رامپور میں غفران مآب نواب محمد سعید خاں بہادر کے عہد سے آخر عہد نواب خلد آشیاں تک متوسّل رہے۔ قد متوسّط۔ جسم دُہرا رنگ صاف۔ ڈاڑھی نیچی اور سفید۔ وضع قدیمانہ۔ آواز درمیانی پڑھنا سیدھا سادہ بلا تصنع۔ جوتہ گھیتلا[1] پہنتے تھے اور ہمیشہ پالکی میں آتے تھے ۱۲۹۵ھ ہجری میں ۸۰ سال کی عمر تھی۔ بعمر ۸۴ سال ۱۲۹۹ھ میں بمقام رامپور انتقال کیا۔ تمثیلی مشاعرہ میں اُن کی غزل معز الدین متعلم کلاس دوازدہم انٹر کالج مسلم یونیورسٹی نے پڑھی:۔

---

[1] گھیتلا اور کفش بے ایڑی کے زنانے جوتوں کو کہتے ہیں جنھیں گزشتہ عہد میں عموماً عورتیں اور اب کہیں کہیں صرف ایشیائی رسم کے مطابق دلہنیں پہنتی ہیں۔ اس زمانے کے بزرگانِ لکھنؤ بھی اکثر پہنا کرتے تھے۔ ۱۲

غزل

نبضِ بیمار جو اے رشکِ مسیحا دیکھی — آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

ہر جگہ وضع نئی چال نئی لوگ نئے — ہم تو جس شہر میں پہنچے نئی دنیا دیکھی

سب چلے جاتے ہیں کچھ راہِ عدم دور نہیں — دیکھنا ہم بھی چلے جائیں گے دیکھا دیکھی

خندۂ گل ہے کہیں نالۂ بلبل ہے کہیں — سیر اس گلشنِ ایجاد میں کیا کیا دیکھی

لے چلے باغِ جناں میں جو فرشتے ہم کو — دیر تک راہ تری اے گلِ رعنا دیکھی

چشمِ نرگس کا اشارہ ہے یہی گلشن میں — چار دن سیر جو دیکھی تو بھلا کیا دیکھی

دیدۂ دل سے نظر کی رخِ جاناں پہ اسیر
چشمِ موسیٰ سے صفائے یدِ بیضا دیکھی

(۱۶)

عروج ۔ منشی احمد حسین خاں نام ۔ پیدائش فرخ آباد ۔ اصل وطن قصبہ آسیون جو مضافاتِ لکھنؤ میں ہے دہلی اور لکھنؤ میں اکثر قیام پزیر رہے پھر کانپور میں بود و باش اختیار کی ۔ دربارِ رامپور کے وظیفہ خوار تھے ۱۲۹۵ھ ہجری میں ۵۹ برس کی عمر تھی ۔ ناسخ اور اُن کے شاگرد رشک کو اپنا کلام دکھایا تھا ڈاڑھی سفید لمبی ۔ رنگ گورا ۔ بدن موٹا ۔ بلند آواز ۔ پڑھتے وقت ہاتھ اور آنکھ کے اشاروں سے کام لیتے تھے ۔ لباس حسب وضع قدیم ۔ چودھری شمس الاسلام متعلم کلاس یازدہم انٹر کالج مسلم یونیورسٹی نے اُن کی غزل پڑھی :-

غزل

آنکھ اُن کی دکھائے نہ خدا جور و جفا میں — یہ رنگ ہے جب چشم نمائی کا حیا میں

کہتا ہے کہ شاید کوئی دل مانگ اُٹھے اپنا — ہاتھوں سے نکلتا رہے کچھ راہِ خدا میں

تقدیر کی افتاد سے چلتا نہیں کچھ زور — کیوں لیجیے احسانِ عصا لغزشِ پا میں

فرماتے ہیں مجھ سے کہ خبر لیجئے اپنی — نام آپ کا بھی آنے لگا اہلِ وفا میں

دم مارنے کی جا ہو تو کچھ منہ سے نکالوں | اک لطفِ خدا اور ہی ظالم کی جفا میں
بیمارِ محبّت کو جو پوچھا کہ بچے گا، | منہ پھیر کے بولے کہ یہ طاقت ہی خدا میں

ایمان سے کہتا ہی عروجِ جگر افگار
کیا چیز ہے رونا غمِ شاہِ شہدا میں

(۱۷)

حیا۔ صاحب عالم مرزا رحیم الدین خلف صاحب عالم مرزا محمد کریم الدین گورگانی دہلی کے شاہی خاندان سے تھے۔ جوانی سے آخر عمر تک دربارِ رام پور سے متعلق رہے۔ اور مع اہل وعیال وہیں قیام رہا۔ اب بھی اُن کی اولاد رامپور میں موجود ہی۔ علاوہ شعر و شاعری کے شطرنج میں بھی کمال حاصل تھا۔ فنِ سخن میں شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے۔ دو دیوان ان کے مرتب تھے ۱۲۹۵ھ ہجری میں تراسی برس کا سن تھا۔ قد و قامت متوسط رنگ صاف۔ ڈاڑھی بڑی۔ اکثر وسمے کا خضاب لگاتے تھے اور کبھی بغیر خضاب بھی رہتے تھے۔ ٹوپی سفید ذرا اونچی پہنتے تھے اور ہمیشہ ٹیڑھی رہا کرتی تھی کبھی کبھی عمامہ بھی باندھ لیتے تھے۔ دانت ٹوٹ جانے کی وجہ سے پڑھنے میں پوپلا پن ظاہر ہوتا تھا۔ محمد طاہر حسین نسیری متعلم کلاس یازدہم انٹر کالج مسلم یونیورسٹی نے ان کی غزل پوپلے پن سے پڑھی اور خوب پڑھی۔ جس پر ان کو اوّل نمبر کا انعام ملنا تجویز ہوا۔

غزل

آنکھ سے آنکھ رہ گئی مل کے | دل میں ارمان رہ گئے دل کے
داغ سینے کے، آبلے دل کے | پکّے پھوڑے ہوئے ہیں چھل چھل کے
ایسے ہوتے ہیں ولولے دل کے | کیسے ٹکڑے کیے سلاسل کے
داغ سینے کے، دل کے سوکھ گئے | پھول پژمردہ ہو گئے کھل کے
دوست کیسے قضا نہ آکے پھری | کوئی آیا نہ وقت مشکل کے
رفتہ رفتہ عدم کو پہنچیں گے | سب مسافر ہیں ایک منزل کے

ہو لیا ساتھ اُس ستمگر کے

دل نے مارا مجھے حیا ل کے

(۱۸)

شاغل - آغا مرزا - برادر اوسط مرزا داغ - سانولا رنگ - دُبلے پتلے، ڈاڑھی دو انگل - کچھ پھری ہوئی قد متوسّط لباس مرزایانِ دہلی کا - انگرکھے پر اکثر کوٹ پہنا کرتے تھے اور ٹوپیکا خاص وضع کا باندھتے تھے، جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہی اکثر جیبوں کا چھپا ہوا ہوتا تھا - سر پر پٹّھے تھے - مزاج میں درویشی غالب تھی - آواز بہت اونچی نہ تھی مگر پڑھتے وقت کچھ زور دیکر پڑھا کرتے تھے ۱۲۹۵ھ میں اُن کی عمر قریب ۳۸-۳۹ برس کے تھی تینتیس بتیس برس ہوئے کہ رام پور میں انتقال کیا - اُن کی غزل محمد واصل متعلم کلاس یازدہم نے پڑھی -

غزل

تھے کہاں آئے کہاں جائیں گے کس جا دیکھئے ۔۔۔ ایک مشتِ خاک کا چکر میں آنا دیکھئے

دیکھتے ہیں دیکھنے والے ہر صورت اُس سے ۔۔۔ طور پر جا جا کے موسیٰ آپ جلوا دیکھئے

ایسے بے چینوں کی گنجایش مرے دل میں نہیں ۔۔۔ حضرتِ دل اور کوئی اب ٹھکانا دیکھئے

دیکھتے ہیں اپنے بیگانے مرے دل کی تڑپ ۔۔۔ آپ بھی اپنی نگاہوں کا کرشما دیکھئے

لکھدیا ظالم نے بس اتنا جوابِ خطِ شوق ۔۔۔ آپ پہلے اپنی قسمت کا نوشتا دیکھئے

کیا کہوں گا داورِ محشر نے گر اتنا کہا ۔۔۔ لیجئے یہ نامۂ اعمال اپنا دیکھئے

گو تڑپتا ہو وطن جانے کو دل شاغل مگر

دیکھی ہو جس کی بہار اُس کی خزاں کیا دیکھئے

(۱۹)

منیر - سید محمد اسمٰعیل حسین متوطن شہر شکوہ آباد - شاگرد شیخ ناسخ و رشک لکھنوی - مشہور اساتذہ میں گزرے ہیں بڑے پُرگو اور ہمہ گیر شاعر تھے - ۳ دیوان اور ایک مثنوی تین ہزار ابیات کی اور دیگر رسائل و تقاریظ و تواریخ بکثرت اُن کی یادگار ہیں - غدر ۱۸۵۷ء میں نواب باندہ کی مصاحبت کے سلسلے میں حکومت کی نظر میں مشتبہ

ہوئے اور کالے پانی (جزیرہ انڈمان) کو بھیج دیئے گئے۔ چند سال کے بعد وہاں سے رہا ہوئے اور بالآخر دربارِ رامپور کے متوسّل رہے ۱۲۹۵ھ میں ۷۲ برس کی عمر تھی۔ ڈاڑھی گھنی دو ڈیڑھ انگل کی۔ اکثر وسمے کا خضاب لگاتے تھے۔ کبھی بے خضاب بھی رہتے تھے۔ قد متوسط مائل بہ پستی جسم دُہرا۔ رنگ گندمی۔ لباس میں دُہرے بندوں کا انگرکھا یا اچکن پہنتے تھے۔ آواز متوسط اور پڑھنے کی ترکیب نہایت دل کش تھی۔ حرکات کم کرتے مگر شعر کو دوبار پڑھتے تھے۔ ان کی غزل مقبول الرحیم متعلم کلاس دوازدہم نے پڑھی اور خوب پڑھی جس کے صلے میں اُن کو تمغا دیا گیا۔

غزل

طفلی کی جوانی میں بھی راحت نہیں ملتی
جو کھیل میں کھوئی ہو وہ دولت نہیں ملتی

کیا ہاتھ مرے پہنچیں گے دامانِ تباں تک
اپنے ہی گریبان سے فرصت نہیں ملتی

ڈھونڈھے ہیں تصاویرِ خیالی کے مرقّع
آنکھوں میں جو پھرتی ہو وہ صورت نہیں ملتی

گلہائے چمن دیکھ کے یاد آتے ہیں احباب
جس کا یہ مرقّع ہو وہ صحبت نہیں ملتی

آئینے کو دیتے ہو عبث شربتِ دیدار
جو پیٹ بھرے ہیں اُنھیں لذت نہیں ملتی

اللہ رے زورِ قلمِ صانعِ قدرت
تصویر سے تصویر کی صورت نہیں ملتی

روداد منیر اپنی زمانے سے جُدا ہے
دنیا میں کسی سے مری قسمت نہیں ملتی

(۲۰)

جلال۔ حکیم میر ضامن علی لکھنوی۔ دورِ آخر کے مشہور اساتذہ میں تھے۔ فن سخن میں بہت قابل محقّق تھے۔ اپنی تحقیق و قابلیت کے اعتماد پر اکثر بحث مباحثہ اور اعتراض کرنے کی عادت تھی۔ مزاج میں نزاکت کے ساتھ کچھ چڑچڑا پن بھی تھا۔ با ایں ہمہ سب اُن کی عزت کرتے تھے۔ پستہ قد۔ سانولا رنگ۔ گٹھا ہوا بدن اور ڈاڑھی خشخاشی تھی۔ آواز بلند تھی پڑھنا بہت بانکا تھا۔ پڑھنے میں کبھی کبھی ہاتھ ہلاتے تھے ۱۲۹۵ھ میں ۴۹ برس کا سن تھا۔ بائیس تیئیس برس ہوئے کہ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ شاعری میں مرزا محمد رضا برق لکھنوی

کے شاگرد تھے۔ اُن کی غزل سید ولی الحق متعلم درجۂ دہم نے پڑھی:۔

غزل

خضر! اس راہ میں لے چلتے نہیں تم مجکو	گم کروں ہوش کو میں ہوش کرے گم مجکو
شوق کی بے خودیوں نے یہ کیا گم مجکو	ڈھونڈھتا ہوں میں تمہیں ڈھونڈھتے ہو تم مجکو
لامکاں ہی میں اُسے ڈھونڈتا ہوں پھر پھر کر	بے ٹھکانے کی سُجھاتا ہے تو ہم مجکو
حشر میں چھپ نہ سکا حسرتِ دیدار کا حال	آنکھ کمبخت سے پہچان گئے تم مجکو
اب میں جاتا ہوں کہاں داغِ جگر کہتا ہے	دل نہیں ہوں کہ جو کر دوگے کہیں گم مجکو
دل مرا فرقتِ ساقی سے بھرا جاتا ہے	یوں نہ خالی نظر آتے تھے بھرے خم مجکو

آپ میں کون ہے سمجھاتے ہیں کس کو یہ جلال
آدمی سمجھے ہوئے ہیں ابھی مردم مجکو

(۲۱)

داغ۔ نواب مرزا خان نام ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۰ء) ہجری میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سرکار رامپور سے توسّل ہوا۔ اور سرکاری فراشخانہ و اصطبل کی داروغگی سپرد ہوئی نواب خلد آشیاں کے بعد حیدر آباد دکن گئے تھے۔ ۵ سال کی اُمیدواری کے بعد حضور نظام آصفجاہ سادس کے دربار میں باریاب ہوئے اور استاد السلطان کا شرف پایا۔ دبیر الدولہ، ناظم یار جنگ، خان بہادر نواب فصیح الملک خطابات پائے اور وہیں ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) میں انتقال کیا۔ شاعری میں خاقانیٔ ہند ذوق کے شاگرد تھے کالا رنگ۔ تنومند۔ قد آور اور وجیہ تھے۔ ڈاڑھی ہمیشہ چڑھی رہتی تھی جس پر سیاہ رنگ کا خضاب ہر دوسرے دن لگاتے تھے۔ آواز بہت بلند اور بارعب تھی۔ پڑھنے کا انداز نہایت دل پسند تھا جب وہ غزل پڑھتے تو ساری محفل میں سناٹا چھا جاتا تھا۔ غزل خوانی میں اعضا کو زیادہ حرکت نہیں دیتے تھے کبھی کبھی ایک ہاتھ اُٹھ جاتا تھا۔ اور پڑھنے کی حالت میں ایک خاص جوش ہوتا تھا جس کے اثر سے خود جھومتے رہتے تھے ۱۲۹۵ھ ہجری میں ۴۹ برس کی عمر تھی۔ اُن

کی غزل محمد عمر متعلم کلاس دوازدہم انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی نے پڑھی :-

غزل

حضرتِ دل! آپ ہیں جس دھیان میں
مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

عشق! جس کشتی کا ہو تو ناخدا
وہ نہ آئے کس طرح طوفان میں

اُس سے پوچھو تم مری آشفتگی
زلف کہدے گی تمہارے کان میں

میرے مرنے کی خبر سن کر کہا
واقعی کچھ بھی نہیں انسان میں

گر فرشتہ وش ہوا کوئی تو کیا
آدمیت چاہیئے انسان میں

دل کی قیمت اک نگہ ہے اے صنم
آ گئے جو آئے ترے ایمان میں

جس نے دل کھویا اُسی کو کچھ ملا
فائدہ دیکھا اسی نقصان میں

لیجیئے دیتا ہوں میں دل کے سوا
اور جو کچھ ہو مرے امکان میں

کس نے ملنے کا کیا وعدہ کہ داغ
آج ہو تم اور ہی سامان میں

انتخاب

غزلیات مشاعرۂ عام

غیر طرح

آرزوؔ۔ افتتاح الرحمٰن صاحب کنڈبائی

کب علانیہ یار نے مارا ۔۔۔ نگہِ شرمسار نے مارا
دیکھتے دیکھتے مجھے سرِ بزم ۔۔۔ جلوۂ حسنِ یار نے مارا
شکوہ اغماض کا نہیں مجکو ۔۔۔ غمزۂ چشمِ یار نے مارا
زلفِ صیّاد کا جو پھیلا دام ۔۔۔ دم نہ پھر کچھ شکار نے مارا
آرزوؔ کو پھرا کے دنیا میں ۔۔۔ گردشِ روزگار نے مارا

ابرؔ۔ منشی احمد بخش صاحب انصاری گنوّری

لبریز یاس و غم ہے پیمانہ زندگی کا ۔۔۔ دل میں ہے اب لٹا دوں مے خانہ زندگی کا
تم بھی ہو کچھ خجل سے میرا ابھی رکا دم ۔۔۔ کہدو تو ختم کردوں افسانہ زندگی کا
آؤ کہ آچکا ہے اب نزع کا پسینہ ۔۔۔ یعنی چھلک رہا ہے پیمانہ زندگی کا
داغِ دل و جگر سے ہر سانس شعلہ زا ہے ۔۔۔ خود شمع بن گیا ہے پروانہ زندگی کا

دامن پہ گر رہے ہیں اے ابر اشک نرگس | لکھتا ہوں خونِ دل سے افسانہ زندگی کا

احسن مارہروی مہتمم مشاعرہ

زندہ انھیں کے دم سے ہے نام و نشانِ دل | جذباتِ حسن و عشق ہیں روحِ روانِ دل
نازِ دنیا نہیں بھی یہ ہے پاسِ حسن و عشق | ایک آستانِ دل ہے تو اک پاسبانِ دل
مفہومِ حسن و عشق ہوس ناکیاں نہیں | گھٹتی ہے اس خیال سے توقیر و شانِ دل
ہے عشق کیا؟ طلب ہے فقط نیک و خوب کی | جو اس سے منحرف ہیں وہ ہیں دشمنانِ دل
وہ حسنِ بدسرشت جو ہو مرکزِ ہوس | ہوتا ہے اُس سے نفع کے بدلے زیانِ دل
دھوکے میں خواہشاتِ غلط کے جو آگیا | ایسا ہوس فریب نہیں قدر دانِ دل
روحانیت نہ جس میں ہو وہ عشق ہے ہوس | ایسی ہوس سے چل نہیں سکتی دکانِ دل
سیرِ مجاز چھوڑ، فریبِ نظر ہے یہ | اُٹھ! بامِ معرفت پہ لگا نردبانِ دل
اللہ رے عاشقانِ حقیقی کی ہمتیں | دیتے ہیں ہنس کے جان دمِ امتحانِ دل
موت اُن کی زندگی ہے فنا اُن کی ہے بقا | ہے رشکِ عیش اُن کو غمِ جاودانِ دل
باغِ خلیل ہے آتشِ نمرود بن گئی | تھی ایک یہ کرامتِ سوزِ نہانِ دل

جناب اصغر گونڈوی

مے خانۂ ازل میں جہانِ خراب میں | ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں
اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا | اب لطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں
کیوں شکوۂ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں | اک تازہ زندگی ہے ہر اک انقلاب میں
اتنا ہوا دلیل تو دریا کی بن سکے | مانا کہ اور کچھ نہیں موج و حباب میں
میں اضطرابِ شوق کہوں یا جمالِ دوست | اک برق ہے جو کوند رہی ہے نقاب میں

میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں | بکھرا دیئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں
اصغر غزل میں چاہیئے وہ موجِ زندگی | جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

ایضاً فارسی

زفیضِ ذوقِ رنگیں صد بہارے کردہ ام پیدا | زخونِ دل کہ می جوشد نگارے کردہ ام پیدا
بسے روحانیاں را در کمندِ خویش آوردم | بہ اوجِ عرشِ اعلیٰ ہم شکارے کردہ ام پیدا
بلے از جلوۂ حسنت جہاں یکسر نمی ماند | بیا اکنوں کہ خود را پردہ دارے کردہ ام پیدا
جہانے را تپش بخشم جہانے را بوجد آرم | دریں خاکسترے حسنِ شرارے کردہ ام پیدا
جہانِ مضطرب را پُرسکوں دانی، نمی دانی | چساں در بے قراری ہا قرارے کردہ ام پیدا
مگر اے پیرو طرزِ جنونِ من نمی دانی | پسِ محمل نشینے صد غبارے کردہ ام پیدا
من از رنگِ وجودِ خویش اصغر نقشہا چینم | برائے جانِ بیخود دست یارے کردہ ام پیدا

اخلاق صاحب

سمجھ لیتا اگر پہلے سے کچھ سود و زیاں قاتل | مٹاتا یوں نہ اپنے باوفاؤں کا نشاں قاتل
وفا کا امتحاں دے کر، وفا کا امتحاں لے کر | اُدھر ہے شادماں بسمل اُدھر ہے شادماں قاتل
گلوئے خشک پر میرے چھری پھیری ہے رک رک کر | ملا ہے خوبیٔ قسمت سے مجکو مہرباں قاتل
خبر کل کی نہیں معلوم کیا ہو کیا نہ ہو۔ لیکن | نہ آئی آج تک لب پر مرے آہ و فغاں قاتل
اسیرِ دام ہے کوئی، کسی پر گر پڑی بجلی | کسی کی ہے زمیں دشمن کسی کا آسماں قاتل

اختر۔ سید اختر امام صاحب متعلم انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی

زندگی درد کے سوا کیا ہے | یہ نہ ہو جب تو پھر مزا کیا ہے

سیکھے نہ تو تبسم گل سے — تیری ہستی کی انتہا کیا ہے
لینے آیا ہے آسماں سے اثر — اب دعاؤں کا پوچھنا کیا ہے
دل نہ جب تک ہو نذرِ آتشِ غم — سوزشِ عشق کا مزا کیا ہے

اختر۔ فیاض اختر صاحب متعلم انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی

جگہ جگہ ہے جو زینت مرے فسانے کی — انھیں کا نام ہے نیرنگیاں زمانے کی
نظامِ قیدِ محبت بدل نہ جائے کہیں — قفس میں یاد نہ آجائے آشیانے کی
لکھی ہیں ہر ورقِ گل پہ دستِ قدرت نے — ہزار رنگ سے شرحیں مرے فسانے کی
کبھی کبھی جو قفس پر مرے چمکتی ہیں — یہ بجلیاں ہیں شناسا کسی زمانے کی
مری نظر میں ہے دنیائے آرزو اختر — ذرا ذرا سی ہر اک چیز آشیانے کی

افضال۔ افضال حسین صاحب متعلم بی اے کلاس

وہ اک فریبِ ہوش ہے دنیا کہیں جسے — گمراہیِ نظر ہے تماشا کہیں جسے
ہر جز کے ارتعاش میں ہے اک نمودِ کل — قطرے کا اضطراب ہے دریا کہیں جسے
اس عرصۂ حیات میں ممکن نہیں ملے — وہ حدِّ انتظار کہ فردا کہیں جسے
میرے جنون کی ہیں یہ وسعت نوازیاں — اک ذرّے کے سوا نہیں صحرا کہیں جسے
افضال دیکھ مسلکِ اہلِ وفا نہ چھوڑ — جائز نہیں ہے عشق میں شکوا کہیں جسے

تاج۔ ظہیر الدین حسن تاج زبیری متعلم اسکول فیض عام میرٹھ

نکل جائے گی پھر حسرت جنونِ فتنہ ساماں کی — ملیں گی جب حدیں دامن سے جا جا کر گریباں کی
نظر آتے ہیں اب ابھرے ہوئے نقشِ وفا قاتل — ترے کشتوں سے رونق ہو گئی گورِ غریباں کی

کفن تانے ہوئے سب اپنی اپنی نیند سوتے ہیں
یہ خاموشی بھی عبرت خیز ہے شہر خموشاں کی

اُچٹتی ہی نظر سے دیکھ لیجے، دیکھ تو لیجے
مرے ذوقِ خلش کو آرزو ہے تیرِ مژگاں کی

جناب جگر مرادآبادی

پوچھنا کیا کتنی وسعت میرے پیمانے میں ہے
سب اُلٹ دے ساقیا جتنی بھی میخانے میں ہے

یوں تو ساقی ہر طرح کی تیرے میخانے میں ہے
وہ بھی تھوڑی سی جو ان آنکھوں کے پیمانے میں ہے

غرق کر دے تجکو زاہد تیری دنیا کو خراب
کم سے کم اتنی تو ہر میکش کے پیمانے میں ہے

شیشہ مست و بادہ مست و عشق مست و حسن مست
آج پینے کا مزا پی کر بہک جانے میں ہے

حسن کی ایک ایک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی گزر جانے میں ہے

منتشر کر دے اسے بھی حسنِ بے پایاں کے ساتھ
زندگی شیرازۂ دل کے بکھر جانے میں ہے

اُٹھ گیا کافر جگر سا کیا کوئی بھی حق پرست
حشر ہے کعبے میں برپا شور بتخانے میں ہے

حلیب۔ حبیب احمد صاحب متعلم مسلم یونیورسٹی اسکول

گر کوئی تیری خاکِ پا نہ ہوا
پھر برابر ہے سب ہوا نہ ہوا

دیکھ لیں گے چمن اسیرِ قفس
گر مقدر کا آب و دانہ ہوا

علم وہ بحرِ بیکراں ہے حلیب
کوئی ساحل سے آشنا نہ ہوا

شورؔ۔ محمد منظور حسین صاحب متعلم بی اے کلاس

شیرازۂ سکوں کو پریشاں کئے ہوئے
بیٹھا ہوں اشک و آہ کا ساماں کئے ہوئے

ہر اشکِ خوں کو گوہرِ غلطاں کئے ہوئے
لایا ہوں زیبِ دامنِ مژگاں کئے ہوئے

آواز دے رہا ہوں جنونِ خراب کو
صد اہتمام جیب و گریباں کئے ہوئے

نے بدل دیا ہے مذاقِ حیات آج — ہوں مجمع حواس پریشاں کئے ہوئے
یوں ہیں شور یہ کیا خندہ زیرِ لب — رعنائیِ سکوت کو عریاں کئے ہوئے

شبیرؔ۔ سید شبیر احمد صاحب فرخ آبادی متعلم ایف اے

تا بکے حیرتِ وجود و عدم — توڑتا ہوں طلسمِ راحت و غم
بے خودی کا ہے ہر طرف عالم — اٹھ رہے ہیں نہ دل نہ ذکرِ صنم
ہے تلاشِ ہدف میں تیر اُن کا — دل کے ذرات ہو رہے ہیں بہم
حسن ہے ساغرِ مئے رنگیں — عشق ہے ایک لغزشِ پیہم
سُننے والا نہیں کوئی شبیرؔ — کس سے جا کر کہیں حکایتِ غم

طاہرؔ۔ طاہر حسین صاحب زبیری متعلم ایف اے کلاس

جانِ سوزاں قلبِ بریاں چشمِ گریاں لے چلا — قیس صحرا میں بہلنے کو یہ ساماں لے چلا
کوئی دامن میں چلا گلہائے نظارہ لئے — دیکھنے کا دل میں اپنے کوئی ارماں لے چلا
ہے یہی طاہرؔ گلہ اُس بت کے در پر ہر گھڑی — جب میں آیا ایک تازہ داغِ پنہاں لے چلا

ظفرؔ۔ ظفر احمد خاں صاحب متعلم ایف اے کلاس

یہ سناٹے کا عالم یہ بیاباں دیکھتے جاؤ — خدارا جانبِ گورِ غریباں دیکھتے جاؤ
خوشی سے منظرِ چاکِ سحر کے دیکھنے والو — ادھر آؤ مرا چاکِ گریباں دیکھتے جاؤ

میسر سیرِ جنت ہو پسِ مردن یقیں کس کو
ظفرؔ مرنے سے پہلے کوئے جاناں دیکھتے جاؤ

عزیز - جناب عبدالعزیز پوری صاحب لکچرار انٹر کالج مسلم یونیورسٹی

رحمت بہانہ جو ہے گنہگار بھی تو ہو | بندوں میں کوئی اس کا سزاوار بھی تو ہو

ہر گل میں تو ہے کوئی طلبگار بھی تو ہو | نرگس کی طرح حسرتِ دیدار بھی تو ہو

زاہد نہ ہوگا یوں کرم حق کا مستحق | پہلے گناہ کرکے گنہگار بھی تو ہو

مجھ پر ہی رات دن ہے تقاضائے ضبطِ آہ | کچھ امتحانِ مجمعِ اغیار بھی تو ہو

تصویرِ یار دیکھکے صبر آئے کس طرح | جی چاہتا ہے شوخیِ گفتار بھی تو ہو

دلداریِ مریض بھی دل لے کے چاہیئے | تم دل ربا ہی تو نہیں دلدار بھی تو ہو

موجود بے شمار خریدار ہیں عزیز | یوسف سا کوئی رونقِ بازار بھی تو ہو

عمر - مولوی محمد عمر خاں صاحب شروانی رئیس بھیکم پور

تصور تو ہر دم ترا دل نشیں ہے | مگر حسرتوں میں یہ جانِ حزیں ہے

جواب اُن سے قاصد نے مانگا تو بولے | نہیں ہے نہیں ہے نہیں ہے نہیں ہے

نہ کعبے میں دیکھا نہ مندر میں پایا | نشاں لامکاں کا بھی پایا کہیں ہے

وصال اُن کا کیسا ملاقات کیسی | کبھی ہوگا ایسا یہ کس کو یقیں ہے

مرض میں بھی لکھی غزل تو نے ایسی | عمر واہ شاباش صد آفریں ہے

عمر - محمد عمر صاحب بدایونی ملازم دفتر مسلم یونیورسٹی

دل مہر و التفات کا حامل نہیں رہا | اُن کی نگاہِ ناز کے قابل نہیں رہا

پھر دیکھنے لگا ہوں میں نیرنگیِ جمال | اب پردۂ حجاب مقابل نہیں رہا

گرداب ہے سفینہ ہے طوفاں ہے موج ہے | گردش سے بخت کے کہیں ساحل نہیں رہا

وارفتگیِ جوشِ محبت کو کیا کروں | قابو تھا جس پہ عقل کا وہ دل نہیں رہا

اپنی تمام عمر گئی رائگاں عمر — افسوس کچھ بھی زیست کا حاصل نہیں رہا

جناب فرّخ بنارسی

درسِ عبرت مجھے دینے لگے ارکانِ حیات
کاش اب کوئی بدل دے مرا عنوانِ حیات

ہمہ تن شوقِ اجل ہوں ہمہ حرمانِ حیات
زندہ ہوں پر نہیں شرمندۂ احسانِ حیات

چارہ گر رہنے دے محوِ خلشِ درد مجھے
پردۂ درد میں مستور ہے درمانِ حیات

بے دھڑک کود اگر آتشِ نمرود بھی ہو
خوفِ جاں کیا کہ اجل خود ہے نگہبانِ حیات

بے پری رشتۂ پا، جلوۂ گل، دامِ نظر
آشیاں ہے کہ قفس دونوں ہیں زندانِ حیات

اک ادا ہی ترے جلوے کی خزاں ہو کہ بہار
آفریں اے چمن آرائے گلستانِ حیات

کب تک او بے خبرِ مرگ یہ غفلت کب تک!
آٹھ بہت دیکھ چکا خوابِ پریشانِ حیات

لذّتِ ناوکِ بیداد مبارک اے دل
ایک اک زخم ہے سرمایۂ عرفانِ حیات

تپشِ دل سے ہے وابستہ نظامِ ہستی
درد کہتے ہیں جسے اصل میں ہے جانِ حیات

جلوۂ دہر ہے اک پرتوِ حُسنِ رنگیں
کچھ نہیں ورنہ پسِ پردۂ ایوانِ حیات

آخری سانس تک آیا نہ سمجھ میں یہ راز
خارِ غم دل میں کھٹکتا ہے کہ پیکانِ حیات

دے جگہ اے لحد آغوشِ کرم میں اپنی
مُنھ چھپائے ہوئے آیا ہے پشیمانِ حیات

دل ہی ہے حاصلِ افسانۂ رازِ کونین
یہی عنوانِ فنا ہے یہی عنوانِ حیات

اسی پردے میں ہے وہ جانِ تمنا فرّخ
تم اٹھاؤ تو ذرا پردۂ ایوانِ حیات

مضطر - سید علی قدیر صاحب

جلوہ ایسا دکھا دیا کس نے
محوِ حیرت بنا دیا کس نے

آنکھ کس کے لئے ہے لالہ فرش
خوں چکاں دل بنا دیا کس نے

حسن کو کس نے کر دیا خود بیں
عشق کو یوں بھلا دیا کس نے

بادۂ دردِ دل سے اے مضطر
مست ایسا بنا دیا کس نے

منظر۔ مصطفٰے حسین صاحب جلیسری

جس سمت دیکھتا ہوں ٹھکانا اُدھر نہیں
صیّاد مجھ سے خوشش نہیں گلشن میں گھر نہیں

صیّاد کیا بتاؤں تجھے آشیاں کا حال
جب سے کہ میں اسیر ہوا کچھ خبر نہیں

اے چارہ گر خدا کے بھروسے پہ چھوڑ دے
اب قابلِ علاج یہ دردِ جگر نہیں

محشر۔ محمد عبدالوحید صاحب متعلّم ایف اے کلاس

اک جہاں ہے ترا تماشائی
اللہ اللہ رے شانِ رعنائی

بس کر اے صبر آزمائش۔ بس
اب نہیں طاقتِ شکیبائی

اے خیال، اے تصوّرِ جاناں
ہاں ٹھہر جا ابھی ہے تنہائی

رنگ دنیا کا دیکھکر محشر
اب نہیں شوقِ بزم آرائی

مست۔ شمشاد علی صاحب انصاری گنوری

لغزشیں ہوتی ہیں پیہم درِ جاناں کے قریب
گم ہوا جاتا ہوں میں جادۂ عرفاں کے قریب

تیغِ ناز آ گئی کیا میری رگِ جاں کے قریب
بجلیاں سی ابھی کوندی ہیں گریباں کے قریب

حسنِ رنگیں کی ملاحت میں تبسم کی ادا
یعنی اک اور نمکداں ہے نمکداں کے قریب

کھینچ آہستہ کہ ہو جائے گی درہم برہم
ایک دنیائے تمنا بھی ہے پیکاں کے قریب

کیا کہا جوششِ جنوں! دستِ طلب افزوں ہو
اور اگر ہاتھ پہنچ جائے رگِ جاں کے قریب

مست اُس روئے مصفا پہ مٹا جاتا ہوں
موت آئی ہے مجھے چشمۂ حیواں کے قریب

مظفر۔ حافظ قاری سید مظفر علی صاحب زیدی نگینوی

محشر میں جب وہ لیں گے مرا امتحانِ دل
شیدائے مصطفٰے ہوں یہ ہوگا بیانِ دل

کیوں کر نہ کہئے اُس کو مکینِ دیارِ قدس — عشقِ رسول میں ہے مدینہ مکانِ دل
کیوں کر یقینِ عشق دلاؤں میں آپ کو — کیوں کر دکھاؤں آپ کو دردِ نہانِ دل
اُس ماہ وش کی یاد مظفر نہیں گئی — صد پارہ کیوں نہ ہجر میں ہو پھر کتانِ دل

مضطر - عمر علی صاحب صدیقی متعلم ایف اے کلاس

تو جفا کرتا ہے اغیار ہنسا کرتے ہیں — ہم تری خیر مناتے ہیں دعا کرتے ہیں
صفحۂ دہر میں ہم صورتِ گلہائے چمن — نقشِ موہوم ہیں بن بن کے مٹا کرتے ہیں
شکوۂ جورِ صنم یا غمِ دل کا ماتم — غیر کے آگے جو کرتے ہیں برا کرتے ہیں
بے زبانی کا یہ عالم ہے کہ مضطر گفتگو — چپکے بیٹھے ہوئے اوروں کی سنا کرتے ہیں

وفا - سید شاہ خلیل الرحمٰن صاحب عظیم آبادی متعلم بی اے کلاس

بھلا ہو ساقی کا مے سے بھر دے فقیر جیتے ہیں تیرے دم سے — پیالہ خالی لئے ہم اپنا نہ جائیں گے اب درِ کرم سے
ہے ہمارا جنوں سلامت ہزاروں صحرا کو چھان لیں گے — اس ایک دنیا کی کیا حقیقت کہ ناپ ڈالا جسے قدم سے
تم آئینے میں سنور رہے ہو تمہیں دکھائی ہے شان اپنی — غریب شانہ الجھ رہا ہے تمہارے زلفوں کے پیچ و خم سے
وہ مست آنکھیں وہ بانکی چتون شباب کی وہ نئی امنگیں — وہ چاند سا منھ دراز گیسو وہ حشر برپا قدم قدم سے
وفا یہ شرطِ وفا نہیں ہے کہ رازِ سربستہ کھول بیٹھو — خدا نہ کردہ بنے جو دم پر تو منھ چھپانا پڑے صنم سے

ولی - سید ولی الحق صاحب متعلم درجۂ نہم

کر سکیں گے ہم اگر کچھ تو مسلماں ہو کر — پائیں گے کچھ تو فقط صاحبِ ایماں ہو کر
زندگی قوم کی کہتے ہیں کہ بیداری ہے — اب بھی جاگ اٹھیں کہیں قوم کی ہم جاں ہو کر
غیر ممکن ہے مرے جوش کے آگے ممکن — میں نے کیا کیا نہ کیا عاجز و انساں ہو کر

کون ہے جو نہیں واقف ہے مری قوت سے
اے ولی نام کیا میں نے مسلماں ہو کر

مآنی - مولوی سید کلبِ احمد صاحب جائسی

دل کی فنا پہ غم کی فنا کا مدار ہے | لیکن فنائے دل کا کسے اعتبار ہے

عمرِ ابد بھی ہو تو ترا انتظار ہے | آخر تو دل ہے اور دلِ امیدوار ہے

یارب مرا جنوں ہے کرشمہ بہار کا | یا میرے ہی جنوں کا شگوفہ بہار ہے

انجام کا لقب نگہِ واپسیں ہوا | حالانکہ یہ وہی نگہِ انتظار ہے

اک شعبدہ امید کا تھا اضطرابِ دل | اعجازِ یاس یہ ہے کہ گویا قرار ہے

ہاں سچ ہے ذمہ دارِ عمل ہے مرا وجود | لیکن وجود جبر ہے یا اختیار ہے

معلوم ہو سبب تو بتاؤں سبب تمھیں | اتنا ہی جانتا ہوں کہ دل بے قرار ہے

باقی ہے اُن کا حسن تو کس کے لئے فنا

مآنی جہاں تو سب تہِ دامانِ یار ہے

مواخات

(از محمد ظفر صاحب صدیقی بدایونی متعلم یازدہم کلاس انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی)

چشمِ ظاہر حاجبِ روئے حقیقت تا کجا؟ تا کجا یہ امتیازِ قوم و ملت تا کجا؟
مشربِ میخوار و زاہد میں کہاں تک انحراف؟ پارسا و رند میں آخر کہاں تک اختلاف؟
دیدۂ باطل کہاں تک فرقِ سلطان و فقیر؟ اے دلِ شوریدہ کب تک بحثِ درویش و امیر؟
کس لئے ہے یہ تفاوت حاکم و محکوم میں؟ کشمکش کس واسطے ہے ظالم و مظلوم میں؟
اک ذرا وسعت تو دے اپنے خیالِ تنگ کو پھر تماشا کر جہانِ آب و گِل کے رنگ کو
ایک ہی شمعِ ازل ہے جس کے سب پروانے ہیں ایک ہی عنوان ہے اور مختلف افسانے ہیں
ایک ہی نغمہ ہے لیکن فرق ہے آواز میں ایک ہی جلوہ ہے لیکن مختلف انداز میں
ایک ہی مہرِ منور کا ہے سب ذرّوں میں نور ایک ہی جلوہ ہے جس کا ہے کہ و مہ میں ظہور
اک عمارت کے ستوں ہیں سب بنی نوعِ بشر ایک سے ہے دوسرے کو تقویت باہم دگر
سب کی یکجا سعی پر ہے کامیابی کا مدار سب ہیں بحرِ زندگی میں ایک کشتی پر سوار
ہیں مسافر ایک ہی رستے کے اور منزل بھی ایک کوئی مشکل ہے اگر ہو جائیں سب کے دل بھی ایک؟
اختلاف اور تفرقے آپس کے سارے چھوڑ دیں سلسلہ سب کا اسی اک ذاتِ حق سے جوڑ دیں
ایک دل اک جان ہو جائیں سب افرادِ بشر اس کو کہتے ہیں مواخات و اخوت اے ظفر
ہے اسی سے گلشنِ ایجاد کی باغ و بہار ہے اسی پر عالمِ امکان کا سب دار و مدار
مجتمع ہیں آج جو اس جا یہ سب بادہ پرست نشۂ صہبائے الفت سے ہر اک سرشار و مست
اے دلِ نافہم جلوہ یہ اخوت ہی کا ہے ایک ادنیٰ سا کرشمہ یہ اخوت ہی کا ہے
ہاں یہی وہ چیز ہے تعلیم جو گوتم نے کی شام میں جس کی اشاعت عیسیٰ مریم نے کی
ساری دنیا کو دیا اسلام نے جس کا پیام جس کی توصیف و ثنا کرتے رہے ہیں خاص و عام
منحصر ہے اس پہ فتح و سربلندی قوم کی ہے اسی پر منحصر شیرازہ بندی قوم کی
جس سے منہ موڑا ظفر اس دولتِ بیدار نے چار سو سے اس کو گھیرا ظلمتِ ادبار نے
آشنا کشتی ہوئی اس کی نہ ساحل سے کبھی کارواں محرم ہوا اس کا نہ منزل سے کبھی

مسدّس بہار و خزاں

از

(سید محمد عارف فاطمی سکرٹری انجمن خیابانِ اردو)

دھوم ہے گلشنِ عالم میں بہار آتی ہے — دلِ بلبل کی کلی ہے کہ کھلی جاتی ہے
راہ چلتوں کو لپٹ، پھولوں کی اڑاتی ہے — آسمانوں کو زمیں باغ کی شرماتی ہے
شکرِ منعم سے بھری صوتِ ہزار آپہنچی
کانٹے کانٹے کی زباں پر ہے بہار آپہنچی

خیر مقدم کو صفا آرا ہیں نہالِ دل جُو — تہنیت خوانِ چمن نغمۂ شادی بگلو
غلغلے آمدِ گل کے ہیں جو برپا ہر سُو — سروِ پر فاختہ بھی چڑھ کے پکاری کُو کُو
طرّہ کہتی ہوئی بادِ بہاری آئی
شاہدِ گل کی گلستاں میں سواری آئی

وہ گل و سبزہ و ریحان و بہارِ خرّم — گل کو گلچیں کا عنادل کو نہ صیاد کا غم
ساغرِ گل میں لبالب وہ رحیقِ شبنم — حبّذا دورِ دمادم وہ ایاغِ پیہم
سوت اس باغ کی ہے چشمۂ حیواں کیا ہے
باغِ جنت کا نمونہ ہے گلستاں کیا ہے

کھل گئے عیش کے در ہو گئی دنیا آنند — باغِ عالم میں خزاں کا نہ رہا خوفِ گزند
بلبل و گل میں رہی صحبتِ باہم یک چند — آسماں دشمنِ راحت ہو زمیں کا پیوند
چمن اس بانیِ آزار سے دیکھا نہ گیا
یہ جما رنگ جفا کار سے دیکھا نہ گیا

قہرِ حق ٹوٹ پڑا اُس کی نظر کیا بدلی — اس ستمگر کے بدلتے ہوئے دنیا بدلی
رُت جو بدلی وہ ہوائے چمن آرا بدلی — وہ روشِ نشو و نما کی بھی سراپا بدلی

دفعتہً بادِ خزاں نے ورق اُلٹا کیسا
پھول کمھلائے چلے جاتے ہیں کھلنا کیسا

شاخِ عریاں ہے جو پھولوں سے بھری تھی ڈالی — زرد پتوں کے ہیں انبار شجر ہیں خالی
کہیں گلشن میں نہیں نام کو بھی ہریالی — کرتی ہے بادِ خزاں باغ کی اب رکھوالی

شرحِ رودادِ چمن حشر بپا کرتی ہے
پھول کھلتے تھے جہاں خاک اُڑا کرتی ہے

پڑ گئی کیسی چمن پر یہ الٰہی اُفتاد — نہ وہ گل ہیں نہ وہ سنبل نہ وہ سرو و شمشاد
گل کے اوراقِ پریشاں ہیں ہوا پر برباد — اک طرف بلبلِ نالاں کی یہ پیہم فریاد

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم بہار آخر شد

ابتدا ہی سے یہ ہے سلسلۂ دورِ زماں — غدر و تاراج کہیں ہے تو کہیں امن و اماں
یہ دو رنگی نہیں آزاد نگاہوں سے نہاں — یوں ہی ہے ہستیِ اُمت کی بہار اور خزاں

یوں ہی مسرور کبھی ہیں کبھی مخمور رہیں ہم
مدّعا سے کبھی نزدیک کبھی دور رہیں ہم



مطبوعات مجالسِ ادبیہ انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ

۱- گڑیا کا گھر - از عبدالشکور صاحب ایم اے قیمت .. .. عصر

۲- تذکارِ سلف - از مولانا ضیاء احمد صاحب ایم اے قیمت ۶ر

۳- نظامی اور خسرو - از مولانا ابراحسین صاحب فاروقی قیمت .. .. .. عصر

۴- کتاب الصلوٰۃ - از شیخ علی جواد صاحب بی اے قیمت ۱۲ر

۵- سالانہ مشاعرہ بابت سنہ ۱۹۲۸ء - مرتبہ احسن مارہروی قیمت ۸ر

۶- تمثیلی مشاعرہ مع فوٹو مشاعرہ - بابت سنہ ۱۹۲۹ء مرتبہ احسن مارہروی قیمت .... عصر

ملنے کا پتہ

شیخ عبدالرشید ایم اے ال ال بی سکریٹری مجالسِ ادبیہ
انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ